لمعاتِ نور
سیدی خیر البشر ﷺ کی روشن روشن زندگی
ڈاکٹر خالد عاربی

ڈاکٹر خالد عاربی

رہائش؛ ڈنگہ ضلع گجرات تحصیل کھاریاں

فون ؛ 03008612248 / 03316260480

میل ایڈریس ؛ ift1167@gmail.com

نام کتاب؛ لمعاتِ نور

سنہ تحریر؛ اگست 2008ء

مطبع؛ گنج شکر پرنٹرز لاہور

کمپوزر؛ قاری مصطفیٰ

ڈیزائنر؛ افتخار احمد افتخار

اہتمام؛ کتاب وسنت ڈاٹ کام

انتساب

اپنی اس پہلی تحریری کاوش کا انتساب اپنے پہلے دینی استاد

حضرت مولانا عبداللطیف صاحب

(سابق امیر جماعت اسلامی) ضلع ڈیرہ غازی خان کے نام

کرتا ہوں۔
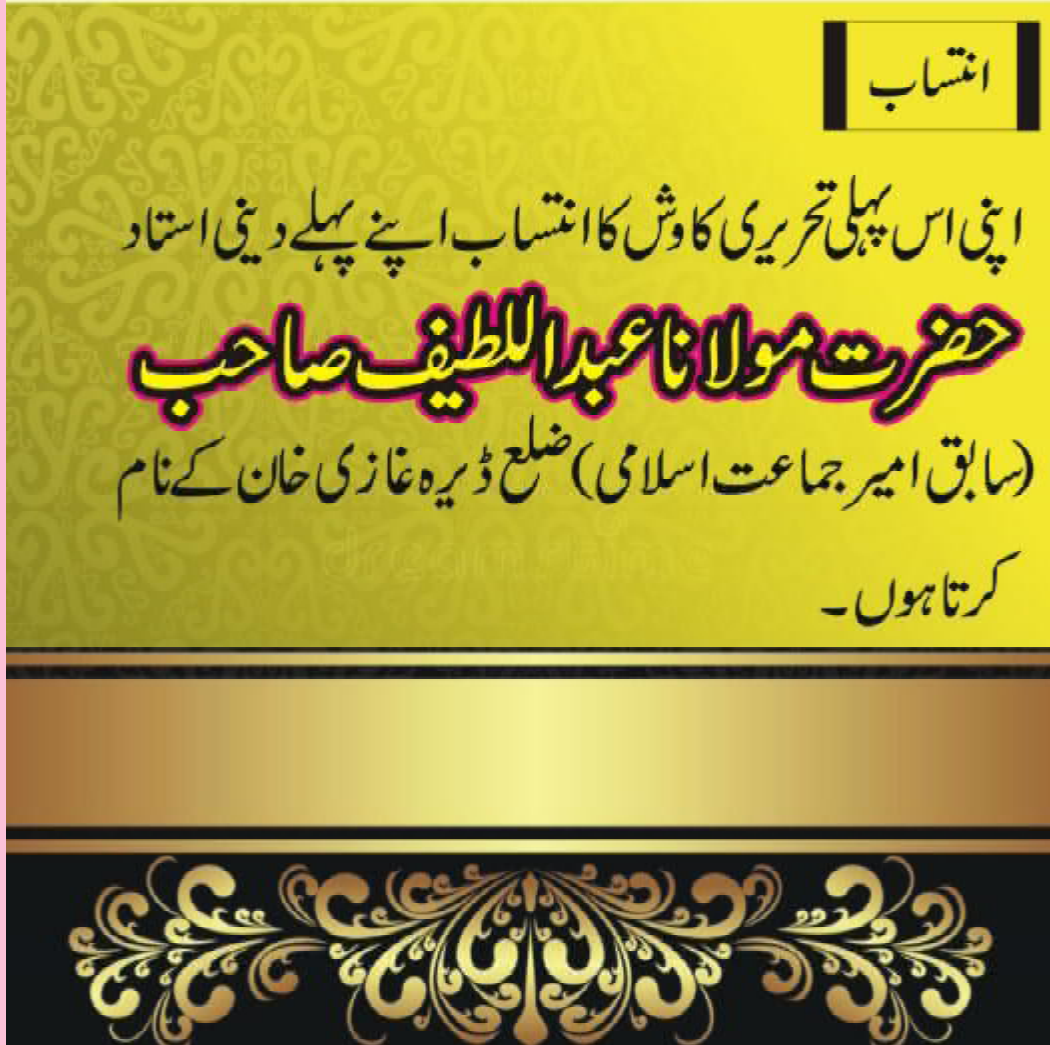
”کیا ایمان لانے والوں کے
لیے، ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان
کے دل اللہ کی نصیحت سے پگھلیں
اور اس کے نازل کردہ دین کے
آگے جھکیں۔اور وہ ان لوگوں کی
طرح نہ ہو جائیں جنھیں پہلے
کتاب دی گئی تھی ، پھر ایک لمبی
مدت اُن پر گزر گئی تو ان کے دل
سخت ہوگئے ۔اور آج ان میں
سے اکثر اور نافرنان بنے ہوئے
ہیں۔

(القرآن ۔ سورۃ الحدید ۔آیت ٦)

حسن ترتیب

لمعاتِ نور

(سیّدی خیر البشر ﷺ کی روشن زندگی)

ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہماری نجات حضور ﷺ کے اسوہ مبارک کی پیروی میں ہے۔ یہ کتاب اس کی طرف دعوت دینے کی ایک عاجزانہ کوشش ہے۔ بندہ نہ تو عالم ہے اور نہ ہی ادیب۔ اس لیے اس کتاب میں نہ تو عالمانہ شان پائی جاتی ہے اور نہ ہی ادیبانہ رنگ۔ یہ محض ایک دعوتی کوشش اور فریضہ دعوتِ دین کی ادائی کا ایک انداز ہے۔ اس کے لیے زبان و بیان کے کسی اعلیٰ معیار کو قائم کرنا کسی طور مطلوب نہیں ہے۔ یہ حضور ﷺ کے در اقدس پر دل و جان نچھاور کرنے کی ایک کاوش ہے۔ اللہ اس کاوش کو قبول فرمائے۔

آمین

ڈاکٹر محمد خالد عاربی

واحسن منك لم تر قط عيني واجمل منك لم تلد النساء
خلقت مبراء من كل عيب كانك قد خلقت كماء تشاء
(حسان بن ثابتؓ)

آپ سے حسین تر، دیکھا نہ کسی بشر،
اور آپ سے جمیل تر،
ماں کسی نے جنا نہیں ہے آج تک،
کوئی نقص؟ کوئی عیب؟ کہاں ملے گا آپ میں،
ہے حقیقت کہ آپ کو، گویا،
بمنشاءِ خود مصور کیا گیا!!

عکسِ محبوب

روایات میں آتا ہے کہ؛

سرورِ عالم ﷺ کا رنگ مبارک گندمی، چمکدار، دِلکش، ملائمت لیے ہوئے تھا،

آپ ﷺ ایک مردِ میانہ قد تھے، نہ بہت لمبے اور نہ پست قد،

اور چاندی سا بدن، جس میں نہ بھاری پن اور نہ ہی ہلکا پن، بلکہ،

نہایت خوبصورت، معتدل اور روشن روشن جسم،

سر کے بال مبارک نہ بالکل سیدھے اور نہ بالکل پیچدار، گھونگریالے اور گنجان،

سینہ مبارک فراخ، دونوں کندھوں کے درمیان عام معمول سے زیادہ فاصلہ تھا،

ہتھیلیاں اور دونوں پاؤں پُر گوشت تھے اور تلوے قدرے گہرے، جوڑوں کی ہڈیاں بڑی بڑی،

چال میں وقار اور متانت لیے، مضبوطی سے پاؤں جماتے جیسے ڈھلوان سے اترتے ہوں،

جھکی جھکی سیاہ آنکھیں، پلکیں دراز، ابرو خم دار، باریک اور جدا جدا،

گول چہرہ جیسے بدر کامل، وقار اور انوارِ نبوت لیے۔ فراخ دہن، پتلے پتلے ہونٹ،

جوفِ دہن میں، چمکدار موتیوں ایسے دانت،

سامنے کے دانتوں میں ایک باریک سی جھری، جہاں سے نور کی کرنیں نکلتیں،

آپ بات کرتے تو گویا پھول جھڑتے،

تبسم بکھیرتا تکلم، ہر لفظ جدا جدا، کانوں میں رس گھولتا، سینے میں ٹھنڈ ڈالتا شیریں کلام۔

حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

(مسلم، کتاب البر والصلۃ)

باعث تحریر آنکہ

کچھ عرصہ ہوا ہمارے شہر کے ایک مولوی صاحب، ایک اور عالم دین کی دوکان پر تشریف فرما، ان سے گپ شپ کر رہے تھے کہ ان کو پیاس محسوس ہوئی۔ اپنی پیاس بجھانے کے لیے وہ دوکان میں رکھے واٹر کولر کی طرف گئے۔ گلاس میں پانی لیا اور وہیں کھڑے کھڑے پینا شروع کر دیا۔ دوکاندار عالم اسے یوں کھڑے کھڑے پانی پیتے دیکھ کر غصے سے لال پیلے ہو گئے اور دینی مدارس میں حاصل کی گئی، احترام آدمیت کی تمام تر تربیت کو پس پشت ڈال کر انھوں نے اس مولوی صاحب کو وہ لعن طعن کی، وہ ڈانٹ ڈپٹ کی کہ وہ دن اور آج کا دن یہ مولوی صاحب اُن کی دوکان پر دوبارہ جانے سے توبہ کر گئے۔ ان حضرات کے غصے کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب کھڑے کھڑے پانی پی کر سنت کی گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ چونکہ اُس نے سنت کے خلاف عمل کیا ہے اس لیے وہ آنجناب کے غصے کا مستحق ٹھہرا ہے۔ محترم عالم دین کا یہ طریق دعوت اور یہ انداز تبلیغ میرے لیے شدید کرب کا باعث ہوا۔ کیونکہ ان کے اس عمل کو بندہ، ہادی عالم ﷺ کے حکیمانہ طریقہ تربیت کے خلاف پاتا ہے۔ اس واقعے کو سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے سیّد عالم ﷺ کا وہ اسوہ مبارک آ گیا، جب ایک دیہاتی نے مسجد نبوی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا تھا صحابہ کرام اس کو مارنے کے لیے دوڑے تو رحمت عالم

ﷺ نے ان کو روک دیا جب وہ دیہاتی اپنی حاجت سے فارغ ہوا تو آپ ﷺ نے اسے اپنے پاس بلایا اور پیار سے سمجھایا کہ مسجد اللہ کا گھر ہوتی ہے، ان کو ناپاک نہیں کرنا چاہیے۔ اور اپنی حاجتوں کے رفع کے لیے دیگر جگہوں کا ااستعمال کرنا چاہیے۔

قربان جاؤں اے رحمت عالم تیری شفقتوں اور محبتوں پر!

آگے ملاحظہ فرمایئے، آپ ﷺ نے کیا کیا؟

مربی اعظم ﷺ نے اپنے جانثار ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

جس طرح تم لوگ اس کو مارنے دوڑے تھے اس طرح تو خطرہ تھا کہ وہ اپنی حاجت پوری کیے بغیر اٹھ کھڑا ہوتا جس سے اُس کی صحت کے نقصان ہونے کا اندیشہ تھا''۔

کسی کو غلطی کرتے ہوئے دیکھ کر اسے سمجھانے کا یہ اسوہ ہے جو سیّد عالم ﷺ نے ہمارے لیے چھوڑا ہے معلوم نہیں یہ عالم دین کس ''سنت'' کی پیروی کر رہے تھے۔ غصہ، ڈانٹ، ڈپٹ، درشتگی اور بات بات پر جھاڑ جھنکار، حکمت تبلیغ کے خلاف ہے۔ اس سے مخاطب کو نہ تو بات سمجھ میں آتی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مثبت اثر ہوتا ہے۔

میڈیکل کی تعلیم کے دوران ہمارے ایک محترم پروفیسر فرمایا کرتے تھے امتحان میں اکثر اسٹوڈنٹس کے فیل ہونے کیوجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اہم اور بڑے عوامل major factors کو یاد رکھنے اور بیان کرنے کی بجائے غیر اہم اور چھوٹے عوامل minor factors کو بیان کرتے ہیں اور ان کی جزیات وتفصیلات تک لکھتے رہتے ہیں۔ یہاں بھی یہی معلوم ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب بھی دین کی بڑی بڑی تعلیمات کو نظر انداز کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی توجہ مرتکز کیے ہوئے تھے۔ یہ رویہ اگر صرف ان کی ذات تک محدود ہوتا تو کچھ تعرض کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن بدقسمتی سے یہ بیماری اس طبقے میں بالعموم رواج پا چکی ہے۔ سیدنا مسیحؑ کے الفاظ میں ہاتھی نگلے جا رہے ہیں مچھر چھانے جا رہے ہیں''۔ رسول اللہ ﷺ نے جادہ زندگی پر رواں رہنے کے لیے جو اسوہ عنایت فرمایا تھا اور جو اخلاقی ضوابط عطا فرمائے تھے، ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور چند ظاہری آداب ورسومات کو سنت نبوی کا نام دے کر ان پر عمل کرنے پر نہ صرف اصرار کیا جاتا ہے بلکہ گالم گلوچ تک نوبت پہنچا

دی جاتی ہے۔احادیث مبارکہ کو سمجھنا اور اُن سے ہدایت اخذ کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔اب اسی پانی والے مسئلے کو لیجئے ذخیرہ احادیث میں کھڑے ہوکر پانی پینے کی ممانعت کی احادیث بھی موجود ہیں اور اس عمل کے جواز کی احادیث بھی موجود ہیں۔ان میں تطبیق کیسے کی جائے؟ یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔اس سلسلے کی چند روایات ملاحظہ ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر پانی پینے سے منع فرمایا ہے،عرض کیا کھانے کا کیا حکم ہے:ارشاد فرمایا؛یہ اس سے بھی سخت ہے۔

(جامع ترمذی،مترجم،جلد دوم ص:۴۴۴ ۔ترجمہ از بوانس محمد یحیٰ گوندلوی)

❑❑❑❑❑❑❑❑

جارود بن علاء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

(جامع ترمذی،مترجم،جلد دوم ص:۴۴۴ ۔ترجمہ از بوانس محمد یحیٰ گوندلوی)

❑❑❑❑❑❑❑❑

ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ زم زم کھڑے ہوکر نوش فرمایا:

❑❑❑❑❑❑❑❑

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ:

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کھڑے ہوکر بھی اور بیٹھ کر بھی پیتے تھے۔

(جامع ترمذی، مترجم، جلد دوم ص:۴۴۴ ۔ترجمہ از بوانس محمد یحییٰ گوندلوی)

□□□□□□□□

حضرت نزال بن سمرہ سے مروی ہے کہ:

حضرت علی نے پانی منگوایا اور انھوں نے کھڑے کھڑے پانی پی لیا اور فرمایا بعض لوگ اس کو برا خیال کرتے ہیں۔ بلاشبہ میں نے آنحضرت محمد ﷺ کو اسی طرح کرتے کرتے دیکھا، جس طرح کہ تم نے مجھ کو دیکھا۔

(بخاری، کتاب الاشربہ، سنن ابوداؤد، مترجم، جلد سوم، ص ۱۳۶)

□□□□□□□□

حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ:

نبی اکرم ﷺ کھڑے ہو کر پانی پیتے تھے۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ:

میں نے رسول اللہ ﷺ کو کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا ہے۔

(شمائل ترمذی و نسائی)

□□□□□□□□

حضرت انس سے روایت ہے کہ:

نبی اکرم ﷺ ہمارے گھر میں داخل ہوئے، ایک مشک لٹکی ہوئی تھی، آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر مشک سے پانی پیا۔اسی طرح کی بات سیدنا انس کی والدہ سے بھی روایت ہوئی ہے۔

(شرح صحیح مسلم از علامہ سعیدی صاحب، جلد ششم۔ص ۲۷۷ بحوالہ سند احمد)

□□□□□□□□

احادیث کی چند معتبر کتابوں سے یہ روایات نقل کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کھڑے کھڑے پانی پینے کی ممانعت بھی کی گئی ہے اور اس کا جواز بھی موجود ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اور امام مالکؒ نے اپنی اپنی کتب میں ایسی کوئی روایت درج نہیں کی جس سے کھڑے کھڑے پانی پینے کی ممانعت ثابت ہوتی ہو۔ ان متضاد روایات کی تطبیق کی علماء کرام نے متعدد کوششیں کی ہیں لیکن روایت کے الفاظ اپنے مدعا میں واضح ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی تطبیق کچھ بھی ہو کم از کم یہ تو ضرور ثابت ہو رہا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے والی روایات کی یوں رجز و توبیخ کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے جس طرح مذکورہ واقعہ میں محترم عالم دین نے طریقہ اختیار کیا تھا۔

یہ طرزِ تبلیغ ہی دراصل اس کتاب کی وجہ تسمیہ ہے۔

صرف اس پر ہی کیا موقوف، مذہبی حلقوں میں تقویٰ خداوندی و خداترسی کے ایسے ایسے مظاہر رواج پا گئے ہیں اور سنت کے نام پر ایسی ایسی قیود گھڑ لی گئیں ہیں جن کی تعلیم ہمیں سرورِ عالم ﷺ کی زندگی میں نہیں ملتی۔ اس کتاب میں ہم نے ہادی عالم ﷺ کی مقدس زندگی کے سمندر سے چند ایسے نایاب موتیوں کا انتخاب کیا ہے جن کی روشنی میں ہم اگر زندگی گزاریں تو سکون کی دولت سے مالا مال ہو سکتے ہیں۔ یہ کتاب یقیناً سیرت کی کتاب ہے لیکن حضور ﷺ کی سوانح حیات نہیں ہے۔ زیادہ تر مواد سیرت کے اخلاقی پہلو سے ہے نہ کہ تاریخی پہلو سے۔ اس کا انتخاب کرتے وقت یہ کوشش رہی ہے کہ مستند کتب سیرت و روایات سے بات لی جائے اور کہیں کہیں ان کے حوالہ جات بھی دیئے گئے ہیں لیکن عام طور پر کتاب کو ان حوالوں سے بوجھل کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے۔ کیونکہ بہرحال یہ ایک تاثراتی کتاب ہے تحقیقی کتاب نہیں۔ قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے اس میں کہانی کا انداز اختیار کیا گیا ہے تا کہ بات کے ابلاغ میں آسانی ہو، لیکن اس انداز کو اختیار کرنے میں مصنف کو خود بے پناہ مشکلات کا سامنا رہا جس کی بنیادی وجہ سیرت کے معیار کی صحت کو قائم رکھنا تھا۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہماری نجات حضور ﷺ کے اسوہ مبارک کی پیروی میں ہے۔ یہ کتاب اس کی طرف دعوت دینے کی عاجزانہ کوشش ہے۔

بندہ نہ تو عالم ہے اور نہ ہی ادیب اس لیے اس کتاب میں نہ تو عالمانہ شان پائی جاتی ہے اور نہ ہی

ادیبانہ رنگ۔ یہ محض ایک دعوتی کوشش ہے جو بہر حال ہم پر فرض ہے۔اس لیے زبان و بیان کے کسی اعلیٰ معیار کو قائم کرنا کسی طور مطلوب نہیں ہے۔ یہ حضورﷺ کی شخصیت کی طرف آنے کی دعوت ہے۔یہ قائدِانسانیت سے راہنمائی لینے کی ایک عاجزانہ درخواست ہے۔یہ حضورﷺ کے درِاقدس پر دل و جان نچھاور کرنے کی ایک گزارش ہے۔اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے۔آمین!

اور آخر میں تمام تر تعریف اللہ کریم کے لیے نذرانہ درود وسلام سیّدی خاتم النبینﷺ کے حضور اور دعا ہے کہ ہم سب کے لیے کہ اللہ پاک ہماری غلطیوں سے درگزر فرمائے اور دین کے لیے ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے اور آخرت میں ہمیں اپنی رضا و خوشنودی سے سرفراز فرمائے۔آمین!

ڈاکٹر خالد عاربی

ایم۔بی۔بی۔ایس

عاربی ہسپتال، ڈنگہ، ضلع گجرات

لمعہ نور: 1 ذلک من سنتی

سیدنا انس بن مالک ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ یہ حضور ﷺ کے ذاتی خادم تھے۔ جس وقت سید عالم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اس وقت یہ دس سال کے ننھے بچے تھے۔ ان کی والدہ محترمہ شہر کی ایک معروف خاتون تھیں۔ سیّدہ اُم سلیم اس چھوٹے بچے کو آنحضور ﷺ کی خدمت میں لائیں اور عرض گزار ہوئیں کہ آپ میرے اس بچے کو اپنی خدمت گزاری کے لیے رکھ لیں۔ سبحان اللہ کیسی محبت اور کیسی جاں نثاری تھی۔ یوں سیدنا انس دس سال تک حضور ﷺ کے خادم خاص رہے۔ ہونہار انس نے نہ صرف خدمت کی ، بلکہ رسول اللہ ﷺ سے دین بھی سیکھا اور پھر اس دین کو امت میں منتقل بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ذخیرہ احادیث میں بہت سی روایات ہیں جو سیدنا انس سے بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے مجھ سے فرمایا:

اے بیٹے! اگر تجھے قدرت حاصل ہو تو اپنے صبح و شام اس طرح بسر کرو کہ تیرے دل میں کسی کے لیے بدخواہی نہ ہو۔ یونہی زندگی بسر کر''۔

یہی میری سنت اور یہی میرا طریقہ ہے۔(کہ میرے دل میں کسی کے لیے کھوٹ نہیں)۔

پھر ارشاد فرمایا کہ:

جس نے میری سنت (طریقہ) سے محبت کی تو بلاشبہ اُس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

(راہِ عمل بحوالہ مسلم،ص ۳۴،جامع ترمذی حوالہ از شرح صحیح مسلم،جلد اول۔ص:۴۳۴)

□□□□□□□□

رسول اللہ ﷺ کی سنت دین کا ماخذ ہے۔آپ کا اسوہ مبارک یقیناً جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔سنت دراصل دین کی وہ روایت ہے جو دین ابراہیم کی شکل میں اصلاح واضافہ کے ساتھ سیدنا محمد ﷺ نے قائم فرمائی۔سنت کا یہ پہلو تو دین کے ماخذ کے اعتبار سے ہے۔سنت کا ایک پہلو اسوہ حسنہ کے اعتبار سے ہے،اس سے ہماری مراد حضور ﷺ کی پاک زندگی کے وہ کام ہیں جو آپ نے انسانی زندگی بسر کرتے ہوئے سرانجام دیئے۔ان میں سے بعض تو حضور ﷺ سے خاص تھے اور بعض افعال وقت اور زمانے کے اعتبار سے آپ کی مقدس زندگی میں پائے جاتے ہیں لیکن آپ نے ان کو بطور سنت جاری نہیں فرمایا۔اور ان میں سے بعض افعال ایسے ہیں کہ اگر چہ وہ وقت اور زمانے کی قید میں تھے لیکن جن اصول وضوابط کے تحت ان کو اختیار کیا گیا وہ ابدی اور لافانی ہیں اور ان کی پیروی باعث نجات ہے۔

جن میں سے ایک اصول کا تذکرہ اس حدیث مبارکہ میں ہوا ہے،یعنی لوگوں سے خیر خواہی کا طرز عمل،اس رویے کو آپ نے اپنی سنت قرار دیا ہے۔ایک اور موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:کہ دین سراسر خیر خواہی ہے۔صحابہ عرض گزار ہوئے کہ حضور کس کی خیر خواہی،آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی، اللہ کی کتاب کی،اللہ کے رسول کی،مسلمانوں کے حکمرانوں کی اور عام مسلمانوں کی۔

سیدنا جریر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ:

میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز پڑھنے، زکواۃ دینے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر بیت کی ہے۔

(مسلم، کتاب الایمان)

□□□□□□□□

انسانوں کا بھلا چاہنا، آپس میں محبت و پیار سے پیش آنا اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کرنا اور ایک دوسرے کا برا نہ سوچنا ہمارے پیارے رسول کی پاکیزہ سنت ہے۔ آپ ﷺ کی سب سے بڑی خیر خواہی تو یہی ہے کہ آپ نے لوگوں کو اپنے خالق اور مالک سے ملانے کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اپنی صلاحیت وقوت کا ایک ایک ذرہ صرف کر دیا اور اس کے لیے کسی اجر کا مطالبہ کیا نہ ارادہ۔ جس دردمندی اور اخلاص سے آپ ﷺ نے یہ کام سرانجام دیا اُس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑا ہو، لوگ اس میں گرا چاہتے ہوں اور وہ ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر آگ میں کودنے سے بچا رہا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی پیاری زندگی میں بیشمار ایسے واقعات ہیں جو آپ کی اس سنتِ خیر خواہی کو ثابت کرتے ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے صرف ایک کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں تا کہ ہمیں کچھ روشنی مہیا ہو۔

آپ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اُس وقت وہاں کی اصل برادری اوس وخزرج تھے۔ جن کو بجا طور پر فرزندز مین (Sons of Soil) کہا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ بھی قحطانی عرب تھے اور ایک باپ کی اولاد تھے۔ کاشتکاری ان کا پیشہ تھا اور قریش ہی کی طرح شرک ان کا مذہب تھا۔ حضور ﷺ کی ہجرت سے قبل ہی یثرب میں اسلام کی کرنیں پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ اور ہجرت تک تقریباً ساری برادری مسلمان ہو گئی تھی۔ اسی بنا پر ان لوگوں نے سید عالم ﷺ کو مدینہ تشریف لے آنے کی درخواست کی تھی۔ اور تبلیغ دین کے لیے رسول اللہ ﷺ کا ہر طرح کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں اوس وخزرج کو انصار مدینہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے داعی اعظم ﷺ کی اس وقت مدد کی تھی جب اپنوں نے وطن سے دیس نکالا دے دیا تھا بلکہ وہ ظالم تو

حضور ﷺ کے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔اوس وخزرج سے جو لوگ دل سے اسلام کو تسلیم نہ کر سکے اُن کو بھی برادری کے ڈر اور خوف کی بنا پر اسلام کا اعلان کرنا پڑا۔اوپر سے مسلمان مگر اندر سے کافروں کا یہ گروہ قرآن کی اصطلاح میں ''منافقین'' کا گروہ کہلاتا ہے۔اندر ہی اندر اسلام کو نقصان پہنچانے ،دوست بن کر دشمنی کرنے اور دین کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں جو کارنامے ان منافقین نے سرانجام دیئے وہ تاریخ ایک تاریک باب ہے۔ان دوست نما دشمنوں کا سردار اور سرخیل عبداللہ بن ابی تھا جو ایک زیرک، چالاک اور بااثر سردار تھا۔تاریخ میں آتا ہے کہ ہجرت نبوی سے ذرا پہلے اس کو یثرب کا بادشاہ بنانا طے ہو چکا تھا کہ سارا قبیلہ مسلمان ہو کر سیدی محمد کریم ﷺ کا غلام بن گیا اب قبیلے والوں کی آنکھوں کا تارا محمد ابن عبداللہ تھے۔اب وہی ان کی دل کی دنیا کے بھی بادشاہ تھے اور کاروبار زندگی کے نگران بھی وہی تھے۔ﷺ

قبیلے والوں کے دباؤ پر عبداللہ بن ابی مسلمان تو ہو گیا لیکن اندر سے وہ شیطان کا شیطان ہی رہا۔وہ ہر نازک موقع پر اسلام اور اہل اسلام کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے میں ذرا برابر بھی نہ چوکتا تھا۔اس کی مکارانہ سازشوں ،ریشہ دوانیوں اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ذاتی پرخاش کے تذکروں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔جس کے بیان کا نہ یہ موقع ہے نہ یہ اس وقت ہمارا موضوع ہے۔لیکن اوپر سے یہ آدمی اپنے آپ کو مسلمان اور اللہ اور اس کے رسول کا تابع فرمان گردانتا ہے۔روایات میں آتا ہے کہ جمعہ کے دن حضور ﷺ کے منبر پر تشریف لانے سے قبل یہ مکار شخص تقریر کیا کرتا اور کہتا کہ لوگو! ہمارے درمیان اللہ کے رسول تشریف فرما ہیں ان کی باتیں غور سے سماعت کرو اور ان پر عمل کرو اسی میں تمھاری فلاح ہے۔وغیرہ وغیرہ

لیکن جب اپنے گھر واپس جاتا تو رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازشیں تیار کرتا،کبھی یہودیوں کو آپ کے خلاف اکساتا اور کبھی اہل مکہ کو اپنی مدد وحمایت کا یقین دلاتا۔اللہ کے پیغمبر کے خلاف نت نئی افوائیں اڑاتا اور کبھی مسلم خواتین کی عزت وآبرو کے درپے ہوتا۔اور کبھی انصار ومہاجرین کو آپس میں لڑانے کی تگ ودو کرتا۔اس سب کا علم رکھنے کے باوجود رسول رحمت ﷺ اس شخص کی دنیوی و اخروی فلاح کے طلب گار ہی رہتے۔اور کبھی اس کی شرارتوں کا جواب کسی اور قسم کی شرارت سے نہ

دیا۔ یہ رئیس المنافقین جب بستر مرگ پہ تھا تو رحمت عالم روزانہ اس کی بیمار پرسی کو تشریف لے جاتے اس کے پاس بیٹھتے اور اس کی خیریت دریافت کرتے ۔ جب یہ منافق اعظم فوت ہوا (ذی قعدہ نوہجری) تو اس کے کفن کے لیے حضورﷺ نے اپنا نبوت والا مبارک کرتہ عطا فرمایا اور اس کا جنازہ پڑھانے کا اعلان فرمادیا۔ صحابہ کرام کی صفوں میں اس اعلان مبارک سے حیرانگی دوڑ گئی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے دشمن اسلام کا جنازہ آپ خود پڑھائیں اور اس کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔

صحابہ کرام کا یہ اضطراب سیدنا عمر کی زبان پرآ گیا اور وہ دربار رسالت میں یہ عرض کیے بغیر نہ رہ سکے کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان حضور کو اس پکے منافق کا جنازہ نہیں پڑھانا چاہیے۔ سیدنا عمر نے گن گن کر اس منافق کی زیادتیاں اور سازشیں شمار کرائیں اور بہت زیادہ اصرار کیا کہ اس کے لیے دعائے مغفرت نہ کی جائے۔ اس کے جواب میں سراپا اخلاص وخیر خواہی نے ارشاد فرمایا: اگر مجھے یقین ہو کہ میرے ستر بار استغفار کرنے سے اس کی بخشش ہوسکتی ہے تو میں ستر بار اپنے اللہ سے اس کی بخشش طلب کروں۔ یہ ہے خیر خواہی کا اعلیٰ ترین نمونہ اور اسوہ حسنہ!

سیدنا ابوہریرہ کا بیان ہے کہ:

ایک دن کا واقعہ ہے کہ ہم اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک خیر البشرﷺ ہمارے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: کیا میں تم کو یہ نہ بتاؤں کہ تم میں سے برا شخص کون ہے اور بھلا کون؟ یوں سوال وجواب کرنا اور صحابہ کو تعلیم دینے کا معلم انسانیت کا معروف طریقہ تھا کہ جو بات سمجھانی ہوا سے سوال جواب کر کے سمجھاتے اور بات کو بار بار دہراتے ،راوی کہتا ہے کہ صحابہ رسول اللہﷺ کے اس سوال پر خاموش ہو گئے۔ تین بار آپ نے یہی فرمایا: اس پر ایک شخص بولا: میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ ارشاد فرمایئے کہ ہم میں سے اچھا کون ہے اور برا کون؟

اس پر رسول اللہﷺ نے فرمایا: بھلا تو وہ شخص ہے جس کی جانب سے بھلائی ہی بھلائی کی امید ہو اور اس سے برائی کا کوئی خطرہ نہ ہو اور بدترین شخص وہ ہے جس کی جانب سے بھلائی کی کوئی امید نہ ہو اور

برائی کا ہر وقت خطرہ لگا رہے۔

(ترمذی)

تجھ پر لاکھوں درود، تجھ پہ کروڑوں سلام
اے رحمت عالم، شفیق و مہرباں رسول

اللهم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کسی جنگل میں موزہ پہننے لگے پہلے دایاں پاؤں اندر کیا، ابھی بایاں موزہ پہننے لگے تھے کہ ایک کوا کہیں سے اڑتا ہوا آیا اور موزہ لے کر اڑتا بنا۔ کچھ اوپر جا کر اس نے موزہ نیچے پھینک دیا۔ نیچے گرتے ہی اس میں سے ایک سانپ نکل بھاگا۔ حضور ﷺ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر یہ ہدایت فرمائی کہ جوتے یا موزے جھاڑ کر پہنا کریں۔

(شمائل ترمذی ترجمہ از مولانا محمد زکریا)

لمعہ نور: 2 دین و دنیا

موسیٰ بن طلحہ اپنے والد سیدنا طلحہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

حضور کی معیت میں میرا گزر کھجوروں کے مالکان کے ہاں ہوا (وہ لوگ اپنا کام کر رہے تھے) آپ ﷺ نے پوچھا یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ سیدنا طلحہ نے کہا کہ یہ لوگ کھجوروں میں قلم لگا رہے ہیں۔ یعنی نر کھجور کو مادہ کھجور کے ساتھ ملاتے ہیں، جس سے وہ زیادہ پھل لاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے خیال میں یہ عمل اُن کو کوئی زیادہ فائدہ نہ دے گا۔ جب صحابہ کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے یہ عمل ترک کر دیا۔ (اس کی خبر) جب رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا میں نے محض ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ میرے کسی ظن پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ لیکن جب میں اللہ کی طرف سے کوئی حکم بیان کروں تو اس پر عمل کرو، کیونکہ میں اللہ پر جھوٹ نہیں باندھتا۔

حضرت نافع بن خدیج کہتے ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کھجوروں میں قلم لگاتے تھے۔آپ ﷺ نے پوچھاتم ایسا کیوں کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم (نسل درنسل) ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں۔آپ نے فرمایا: اگرتم ایسا نہ کروتو شاید بہتری ہو۔لوگوں نے اس پر عمل ترک کر دیا۔اس سے اُس سال کھجوریں جھڑ گئیں یا کم ہو گئیں (راوی کو شک ہے اغلباً پیداوار کم اور ناقص ہوئی ہوگی) لوگوں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں صرف ایک بشر ہوں جب میں تمہیں تمھارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں (تو سمجھ) لو کہ میں صرف آدمی ہوں (اس پر اپنا کوئی فیصلہ کرلو)۔

□□□□□□□□

حضرت انس رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:
رسول اللہ ﷺ کا کچھ لوگوں کے پاس سے گزر ہوا جو کھجوروں میں پیوند لگا رہے تھے۔آپ نے فرمایا: اگرتم یہ نہ کروتو اچھا ہو، (انھوں نے اس عمل کو ترک کر دیا) اس سال ردی کھجوریں پیدا ہوئیں، دوبارہ اُن کی طرف جانا ہوا تو آپ نے کھجوروں کا حال پوچھا، انھوں نے (ساری کیفیت بیان کی) اور کہا: آپ نے اس طرح ارشاد فرمایا تھا، جس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اپنے دنیا کے معاملات زیادہ (بہتر) جانتے ہو۔

□□□□□□□□

تفہیم احادیث:

یہ حدیث تین طرق سے روایت ہوئی ہے جو یہاں نقل کر دی گئی ہے۔جو واقعہ اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے وہ مدینہ طیبہ کا ہے۔مکہ کے مقابلہ میں مدینہ منورہ ایک سرسبز وشاداب علاقہ تھا اور یہاں کے مکین یعنی انصار زراعت پیشہ تھے۔جبکہ مکہ میں جہاں میرے آقا ﷺ پلے بڑھے تھے، زراعت اور

کاشتکاری نہ ہوتی تھی۔ مدینہ طیبہ میں کھجوروں کے باغات عام تھے جن کے انصار ہی مالک تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ہجرت کے فوری بعد کا واقعہ ہے کیونکہ باغبانوں کے جس عمل پر آپ نے استفسار فرمایا تھا اس پر سوال اور تعجب کا موقع جبھی ہوسکتا ہے جب آپ نے ایسا کام ہوتا پہلی بار دیکھا ہو۔ اپنے مواد کے اعتبار سے یہ حدیث نہایت اہم ہے۔ اس میں ایک اہم اصول بیان کیا گیا ہے جس کی طرف توجہ دلانا اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ باٹنی کے موجودہ علم سے ہم اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ جانوروں کی طرح پودوں میں بھی زندگی موجود ہے۔ پودے سانس لیتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ ان کے اندر بھی حیوانات کی طرح نظامِ ہضم واخراج پایا جاتا ہے۔ افزائشِ نسل کے لیے بھی ان کو نر اور مادہ میں کسی نہ کسی طور تقسیم کیا گیا ہے۔ کھجوروں کا پودا بھی نر اور مادہ پودوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پودوں میں بار آوری کے مختلف طریقے ہیں۔ اُن میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پودے کے شگوفے کو مادہ پودے کے افزائشِ نسل والے حصے سے رگڑا جائے جس سے نر دانے اوری Ovry میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ مدینہ کے باغبان غالباً یہی طریقہ استعمال کرتے ہوں گے اور اس وقت یہی کام کر رہے ہوں گے، ایک ایسا شخص جو زرعی معاشرے سے تعلق نہ رکھتا ہو اس کے لیے یقیناً یہ عمل عجیب وغریب رہا ہوگا، اسی لیے آپ کو یہ کام عبث محسوس ہوا۔ اس لیے اسے دیکھتے ہی یہ فرمایا کہ یہ کام کوئی زیادہ مفید نہیں ہے۔ جس کام کو حضور ﷺ غیر مفید قرار دیں تو ان کے جانثار کس طرح اس کام کو اختیار کر سکتے تھے۔ وہی ہوا کہ انصار نے اس عمل کو ترک کر دیا جس سے یہ نقصان ہوا کہ ایک تو پیداوار کم ہوگئی دوسرے یہ کہ جو پھل حاصل ہوا وہ بھی ناقص تھا۔ اس کی سائنسی توجیح وتشریح بڑی واضح ہے۔ بار آوری کا مروج طریقہ زیادہ بہتر تھا، جب اس کو ترک کر دیا گیا تو اس کی وجہ سے بار آوری مکمل نہ ہوسکی اور پھل پیدا نہ ہوسکا اور جو پیدا ہوا وہ ناقص تھا۔

سائنسی قوانین اور ان کے عوامل سب اللہ کریم کے وضع کردہ ہیں۔ سائنسدان تو محض ان کو دریافت کرنے والے ہوتے ہیں یا وہ ان قوانین کی تشریح کرتے ہیں اور ان کا انطباق کر کے نت نئی اور مفید ایجادات کرتے ہیں۔ بعض اوقات انھی فطری قوانین کے بہتر استعمال سے بہترین نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ انصار مدینہ اگرچہ اس سائنسی اصول سے تو یقیناً ناواقف ہوں گے لیکن اس کے استعمال

سے وہ مفید نتائج ضرور حاصل کر رہے تھے۔اللہ کے رسول ﷺ نے اس عمل سے باز آجانے کا عندیہ ظاہر کیا تھا، محض اشارہ دیا تھا اور یہ عاشقان رسول اس کام سے رُک گئے۔اگلی فصل ناقص اور نہایت کم ہوئی، ظاہر ہے کہ ایک فطری عمل میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔قدرت کے قانون بارآوری کو مکمل نہیں ہونے دیا گیا تو نتیجہ پیداوار کی کمی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

اب صحابہ کرام حضور ﷺ سے گزارش کرتے ہیں کہ ہم یہ طریقہ کئی نسلوں سے اختیار کیے ہوئے تھے اور تجربے سے اس کام کو نہایت مفید پایا تھا۔اس سال آپ کے روک دینے سے ہم رک تو گئے مگر نقصان میں پڑ گئے۔ظاہر ہے کہ اب وہ سابقہ طریقہ کار کی بحالی چاہتے ہوں گے، لیکن ڈر یہ تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کام سے منع کیا تھا تو یقیناً یہ کوئی غیر دینی کام ہوگا۔اس کی بحالی کے لیے درخواست کیسے کی جاسکتی ہے۔لیکن اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام کے اس مخمصہ کو جان گئے اور اس موقع پر جو کچھ ارشاد فرمایا وہ سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔اس موقع پر اولاد آدم کے سردار حضور نبی اکرم ﷺ نے وہ ابدی اصول بیان فرمایا جس نے دین اور دنیا کے درمیان فرق کو واضح کیا۔جس نے کار رسالت اور دنیاوی امور کے درمیان حد فاصل قائم کر دی۔آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا یہ تمھاری دنیا ہے جس کو تم بہتر جانتے ہو۔میں رب کریم کے احکامات تم تک پہنچانے آیا ہوں جس بات کو میں اللہ کی طرف منسوب کروں اس کو بلا چوں چراں تسلیم کرو۔اور دنیا کے بارے میں جو بات کروں تو تم اس پر خود فیصلہ کر سکتے ہو۔یعنی نبی اللہ ﷺ لوگوں کو کیمسٹری اور باٹنی پڑھانے نہیں آئے تھے۔نبیوں کا کام فزکس پڑھانا یا پولیٹیکل سائنس پڑھانا نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ادب ولٹریچر پڑھانے اور شعر وشاعری کرنے پر معمور ہوتے ہیں بلکہ وہ تو لوگوں کو دین بتانے آتے ہیں۔اللہ کا پیغام سنانے آتے ہیں۔اپنی دنیا تو لوگوں نے خود ہی بنانی ہوتی ہے اللہ کے رسول لوگوں کی آخرت بنانے آتے ہیں۔اپنے من کی مرضی تو آدمی خود جان لیتا ہے، اللہ کے نبی لوگوں کو اُن کے رب کی مرضی بتانے آتے ہیں۔اسی چیز کا نام دین ہے۔دین کی روشنی انسان نہ تو تجربے سے حاصل کرسکتا ہے اور نہ ہی سائنسی اصول استعمال کر کے۔یہ روشنی تو صرف نبی کی ذات سے حاصل ہوتی ہے اور رسول ہی دین کا ماخذ ہوتا ہے۔حقیقت میں نبی جب کسی معاشرے میں تشریف

لاتے ہیں تو وہ اللہ کا پیغام بر ہونے کے علاوہ اُس معاشرے کا ایک فرد بھی ہوتا ہے۔ انسانی ضروریات واحتیاجات انھیں بھی اسی طرح لاحق ہوتی ہیں جس طرح کسی عام آدمی کو لاحق ہوتی ہیں۔اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہی ذرائع استعمال کرتے ہیں جو دیگر لوگ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے تمام تر دنیاوی امور سر انجام دیتے ہیں۔ ہر نبی کی زندگی کے شب وروز کے معمولات میں اُس معاشرے کا عکس ضرور پایا جاتا ہے۔

پیغمبر اُس معاشرے کے طرز بود و باش، طریق خورونوش اور معاشرتی وسماجی رسوم ورواج کو اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے اپنی صفائی کا اہتمام کرتا ہے۔ اپنا لباس اختیار کرتا ہے، اپنی رہائش بناتا ہے اور روزگار کے لیے کوئی نہ کوئی مروجہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ گویا یہ سب انسانی ضرورتیں ایک نبی کو لاحق ہوتی ہیں اور ان کو وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے پورا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ نبی کی زندگی میں کوئی اخلاقی عیب نہیں ہوتا۔ رسول محترم محمد ﷺ بھی اپنے معاشرے اور سماج کے فعال کارکن تھے۔ آپ نے تجارت بھی کی، نکاح بھی کئے اور برادری اور شہر میں سماجی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ آپ ﷺ کے دور میں معاشرہ اور سماج اپنی تمدنی ترقی اور سماجی شعور کے اعتبار سے جس درجے اور مقام پر تھا، آج صدیوں بعد کہیں دور نکل گیا ہے۔ اُس زمانے میں اور آج کے زمانے کے طرز بود و باش اور ذرائع نقل وحمل اور کاروبار وتجارت وغیرہ کے معاملے میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ لہٰذا ایسا ممکن نہیں کہ آج کا مسلمان حضور ﷺ کے مکان کی طرح اپنا مکان بنائے، یا ہاتھوں سے بنی ہوئی سوئی دھاگے سے سلے کپڑے پہنے یا خچر اور اونٹوں پر سواری کو اپنے لیے لازم جانے کہ یہی سنت رسول ہے۔

یا ایسا کرنا دین کا مطالبہ ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ ﷺ کی مبارک زندگی میں بعض چیزیں روزمرہ استعمال میں تھیں، وہ آپ کا معمول تھیں لیکن اب شاید ہماری زندگیوں میں ان چیزوں کا وجود ہی نہ ہو۔ ان کا استعمال تو کجا، ممکن ہے آج کا کوئی مسلمان ان چیزوں کو ساری زندگی دیکھ ہی نہ سکے۔ جنھوں نے جانوروں کی کھال سے بنے پانی کے مشکیزے دیکھے ہوں جن میں حضور ﷺ کے ہاں پانی رکھا جاتا تھا اور ہمیشہ استعمال میں رہا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ چونکہ مشکیزہ حضور ﷺ کے استعمال

میں تھا اور ہمیشہ استعمال میں رہا ہے لہٰذا اس کا استعمال سنت ہے اور میں تو مشکیزہ ہی استعمال کروں گا ،ایک بوجھ ہے جو انسان خود پر لادے گا یا اسی طرح کی دیگر چیزوں کے استعمال اور پر اصرار کرے کہ یہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے استعمال میں اور آپ کے عمل میں تھیں یا آپ کی پسندیدہ تھیں لہٰذا یہ سنت اور ہمارے لیے لازم ہیں، بدیہی طور پر ایک بے اصل بات ہوگی۔ درج بالا احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ہماری دنیا ہے جیسے ہم نے خود بنانا اور برتنا ہے۔اس کے بنانے کے لیے رب کریم نے ہمیں عقل سے نوازا ہے۔ایسا ممکن ہے کہ بعض اوقات اس دنیا کے معاملے میں انسان کو کوئی اشتباہ لگ جائے اور وہ اللہ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر بیٹھے، اس لیے ایسے مواقع کے لیے اللہ کریم نے اپنی مرضی بتانے کے لیے سلسلہ نبوت و رسالت شروع کیا۔آخروی زندگی کے بارے میں ہمارے پاس جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔اس لیے ہم انبیاء علیہ السلام کی لائی ہوئی ہدایت کے محتاج ہیں۔اس سب کچھ کو دین کہتے ہیں۔گویا دین کا ماخذ نبی کی ذات ہوتی ہے۔اس کے علاوہ دین کہیں سے نہیں مل سکتا۔ یہ دین ہمیشہ دو شکلوں سے ملتا رہا ہے۔ایک کلام اللہ اور دوسری سنت رسول اللہ۔اللہ کے آخری رسول سیدنا محمد ﷺ پر اللہ کا کلام قرآن کی شکل میں نازل ہوا جو ہم تک امت کے قولی تواتر سے پہنچا ہے۔اسی طرح دین کا دوسرا ماخذ رسول اللہ سنت ہے جو دین ابراہیم کی اصلاح شدہ سنت ہے اور یہ ہم تک امت کے عملی تواتر سے پہنچی ہے۔استاد جاوید احمد غامدی صاحب نے سنت کیا ہے اور سنت کیا نہیں ہے پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”سنت صرف دو چیزیں ہوسکتی ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دین ہو یا نبی نے اسے دین قرار دیا ہو قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی اس کا دین پہنچانے کے لیے ہی مبعوث ہوئے تھے۔ان کے علم و عمل کا دائرہ یہی تھا۔اس کے علاوہ اصلاً کسی چیز سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اپنی اس حیثیت نبوی کے ساتھ وہ براہیم بن آذر بھی تھے۔موسیٰ بن عمران اور عیسیٰ بن مریم بھی تھے، اور محمد بن عبداللہ بھی۔(صلوات اللہ علیھم اجمعین) لیکن اپنی اس حیثیت میں انھوں نے لوگوں سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔اُن کے تمام مطالبات صرف اس حیثیت سے تھے کہ وہ اللہ کے نبی ہیں اور نبی کی حیثیت سے جو چیز انھیں دی گئی ہے وہ دین اور صرف دین

ہے، جسے لوگوں تک پہنچانا ان کی اصل ذمہ داری ہے۔

سورۃ شورہ میں اللہ فرماتا ہے کہ:

اُس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے، جس کا حکم اُس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی اے پیغمبر اب ہم نے تمھاری کی طرف کی ہے۔ اور جس کی ہدایت ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو فرمائی، اس تاکید کے ساتھ (اپنی زندگی میں) اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کرو"۔

(القرآن الحکیم --سورۃ شوریٰ ۴۲:۱۳)

❑❑❑❑❑❑❑❑

چنانچہ یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ میں تیر و تلوار اور اس طرح کے دوسرے اسلحہ استعمال کیے ہیں۔ اونٹوں پر سفر کیا ہے، مسجد بنائی ہے تو اس کی چھت پتوں سے پاٹی ہے۔ اپنے تمدن کے لحاظ سے بعض کھانے کھائے ہیں اور ان میں سے کسی کو پسند اور کسی کو ناپسند کیا ہے۔ ایک خاص وضع قطع کا لباس پہنا ہے جو عرب میں اس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپ کے شخصی ذوق کو بھی دخل تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی سنت نہیں ہے اور نہ کوئی صاحب علم اسے سنت کہنے کے لیے تیار ہوسکتا ہے۔

(جاوید احمد غامدی ۔میزان، ص ۶۳)

❑❑❑❑❑❑❑❑

زیر بحث حدیث دراصل یہی بات بیان کر رہی ہے ۔ اور حضور ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا کہ "میرے کسی ظن پر عمل کرنا ضروری نہیں، لیکن جب میں اللہ کی طرف سے کوئی حکم بیان کروں تو اس پر عمل کرو، کیونکہ میں اللہ پر جھوٹ باندھنے والا نہیں ہوں۔ اور یہ کہ میں صرف بشر ہوں۔ جب میں تمہیں تمھارے دین کے متعلق کسی چیز کا حکم دوں تو اس پر عمل کرو۔ اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں (تو سمجھ لو) میں صرف آدمی ہوں (اس پر اپنا کوئی فیصلہ کرلو)۔ اور یہ کہ تم اپنے دنیا

کے معاملات زیادہ (بہتر) جانتے ہو۔وما علینا الا البلاغ

□□□□□□□□

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ٥

لمعہ نور: 3 باتیں نانا جان کی

سیدنا حسن بن علی اور سیدنا حسین ابن علی کا سگا ماموں کوئی نہ تھا۔ کیونکہ ان کے نانا جان محمد کریم ﷺ کی اولاد نرینہ نہ تھی۔ جو تین لڑکے پیدا ہوئے وہ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ البتہ حسنین کریمین کے سوتیلے ماموں بہت تھے۔ ان میں سے ایک ھند ابن ابی ہالہ تھے جو حضرت خدیجہؓ کے پہلے خاوند سے بیٹے تھے۔ جب سیدہ طاہرہ کا نکاح آقائے دو جہاں ﷺ سے ہوا تو یہ اس وقت چھوٹے تھے۔ سیدنا ھند ابن ابی ہالہ حضور ﷺ کی آغوش محبت میں جوان ہوئے آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت کے طفیل ہی یہ اولین ایمان لانے والے لوگوں میں شامل ہوئے۔ سیدنا ھند ابن ابی ہالہ حضور ﷺ کی بیٹیوں کے ساتھ پلے بڑھے۔ یہ ان کے ماں جائے بھائی تھے، اس رشتے سے ان کی یہ اولاد کے ماموں ہی تھے۔ سیدنا حسین اور حسن، ان کا بہت زیادہ ادب و احترام کرتے تھے اور یہ بھی ان شہزادوں سے از حد پیار کرتے تھے۔ سیدنا حسنین کریمین ابھی بچے ہی تھے کہ ان کے نامور نانا جان اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اگرچہ ان شہزادوں نے اپنے بچپن میں اپنے نانا جان سے خوب خوب پیار وصول کیا تھا، لیکن اپنے نانا جان کی عظمت و رفعت اور ان کے منصب رسالت کی باریکیوں سے وہ آگاہ نہ ہو سکے تھے۔ اس عمر کی یادیں بڑی ہی معصومانہ ہوتی ہیں۔ جب یہ شہزادے بڑے ہوئے ہوں گے

اور جب اپنے عظیم المرتبت نانا جان کی محبت بھری باتیں سنتے ہوں گے تو یقیناً خوش ہوتے ہوں گے لیکن افسوس بھی کرتے ہوں گے کہ کاش ہم اس وقت بڑے ہوتے اور اپنے نانا جان کی باتوں سے مستفیذ ہوتے اور ان کی تربیت سے فیضیاب ہوتے۔

اس لیے تاریخ وسیر کی کتابوں میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن سے سیدنا حسن اور سیدنا حسین کی Curosity اور تجسس اور شوق جھلکتا ہے۔ وہ ہر متعلقہ آدمی کے پاس حضور ﷺ کی باتیں سننے کے لیے جاتے تھے۔ فطری طور ان کے اندر یہ خواہش تھی کہ جن لوگوں نے حضور ﷺ کو دیکھا اور سنا ہے، ان سے مل کر آپ ﷺ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں اور اس محبت بھرے تذکرے کو آگے پھیلائیں۔ سیدنا حسن کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے اپنے ماموں جان جناب ہند بن ابی ہالہ سے عرض کیا کہ پیارے ماموں جان رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارک کیسا تھا؟ حضرت حسن کا بیان ہے کہ ماموں جان اکثر ہمیں حضور ﷺ نانا جان کی پیاری پیاری باتیں سنایا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں حضور ﷺ کے حالات وواقعات معلوم کرنے کا بے حد شوق تھا اور میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ حضور اکرم ﷺ کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی مجھ سے پوشیدہ نہ رہے تو جب میں نے ماموں جان سے آپ ﷺ کے حلیہ کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے: حضور اکرم ﷺ بلند پایہ اور بلند مرتبہ تھے۔ آپ کا چہرہ انور چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا دمکتا تھا۔ آپ کا درمیانے قد سے ذرا نکلتا ہوا لیکن لمبا نہ تھا۔ سر مبارک نہ بڑا نہ چھوٹا بلکہ معتدل، کبھی مانگ نکالا کرتے اور کبھی مانگ خود ہی نکلا کرتی۔ چمکدار رنگ، گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں اور چمکتے دمکتے موتیوں ایسے دانت تھے۔

حضرت حسن کا بیان ہے کہ میں ایک عرصہ تک ان باتوں سے خود ہی لطف اندوز ہوتا رہا اور اپنے چھوٹے بھائی حسین سے ان کا تذکرہ نہ کیا۔ ایک دن میں نے یونہی اس سے تذکرہ کیا تو کہنے لگے میں بھی ماموں جان سے یہ سب جان چکا ہوں، بلکہ اس سلسلے کی کئی اور باتیں بھی معلوم کر چکا ہوں۔ حضور ﷺ کی عادات وخصائل کے ضمن میں اور چیزیں ابا جی (یعنی سیدنا علی) سے بھی حاصل کر چکا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے بڑھ کر شوق رکھتے تھے۔ حضرت

حسین کا بیان ہے کہ ایک دن میں اپنے والد محترم جناب علی سے پوچھا کہ آپ اپنے خانہ مبارک میں تشریف لے آتے تھے تو پھر اوقات کو کس طرح تقسیم فرماتے تھے؟ سیدنا علی نے بتایا کہ آپ ﷺ جب گھر تشریف لاتے تو اپنے وقت کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے۔ایک حصہ اللہ کے لیے، دوسرا اہل خانہ کے لیے اور تیسرے حصے کو اپنی ضروریات راحت و آرام کے لیے رکھتے تھے۔ اللہ والے حصے میں آپ اللہ کریم کی عبادت کرتے،نوافل ادا فرماتے،جن میں لمبا لمبا قیام اور پر سکون رکوع و سجود ہوتے۔ دوسرے حصے میں آپ ﷺ اپنی ازواج سے معمول کی گفتگو فرماتے گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتے اور ان سے ہنستے بولتے۔

اپنے وقت کے تیسرے حصے کو مزید دو حصوں میں تقسیم کر کے،ایک ذاتی آرام کے لیے اور دوسرا حصہ لوگوں سے ملاقاتوں کے لیے وقف رکھتے۔ان ملاقات کرنے والوں میں عام طور پر خاص خاص صحابہ کرام شامل ہوتے جو امت کے اہم امور پر مشورہ کے لیے اس وقت تشریف لاتے اور احکامات لے کر واپس عوام الناس کے پاس جاتے۔اس خصوصی وقت میں صحابہ کرام دین و دنیا کے جو امور سیکھتے انھیں آگے پہنچانے میں مستعد رہتے۔خود رسول اللہ ﷺ انھیں نصیحت کیا کرتے کہ جو حاضر نہیں ہیں ان تک میری باتیں پہنچا دو۔اہل علم اور اہل فضل لوگوں کو آپ ﷺ ملاقات کا شرف بخشنے میں ترجیح دیتے۔اہل حاجت اور ضرورت مند بھی ان اوقات میں در دولت پر حاضر ہوتے۔ بعض لوگ دو دو حاجتیں لے کر حاضر ہوتے اور بعض کئی کئی حاجتیں حضور ﷺ کو پیش کرتے اور سیدنا خیر البشر ان کی حاجتیں پوری فرماتے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ ان کو دین و دنیا کے مفید کاموں میں مصروف رکھنے کے لیے ڈیوٹیاں بھی تفویض فرماتے۔ آپ ﷺ ان ملنے والوں کو یہ بھی تلقین فرماتے تھے کہ اپنے علاوہ دیگر لوگوں کی حاجتیں،سوالات و اشکالات اور مسائل و ضروریات سے بھی مجھے آگاہ کیا کرو۔خصوصاً ان لوگوں کے جو کسی وجہ سے خود حاضر نہیں ہو سکتے یا کسی وجہ سے اپنی ضروریات کو بیان کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص بادشاہ تک کسی ایسے شخص کی حاجت پہنچائے جو خود نہیں پہنچ سکتا تو اللہ حق تعالیٰ شانہٗ قیامت کے دن اس شخص کو ثابت قدم رکھیں گے۔ حضور اکرم ﷺ کی ان مجالس

میں ضروری اور مفید باتوں کا ہی تذکرہ ہوتا فضول اور لایعنی باتیں نہ ہوتیں۔ صحابہ کرام دینی امور میں راہنمائی کے طالب بن کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے اور خالی ہاتھ کبھی نہ لوٹتے۔ وہ اس مجلس ہدایت وخیر کے روشن مینار بن کر نکلتے۔ آپ ﷺ حسب استطاعت ان ملاقاتیوں کی خاطر تواضع بھی کرتے۔ سیدنا حسین نے اپنے ابا جان اور اپنے ماموں جان سے رسول اللہ ﷺ کی گھر سے باہر کی زندگی کے بارے میں بھی کھوج کرید کی۔ تو انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ضروری امور کے علاوہ زبان نہ کھولتے تھے۔

فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرتے۔ آنے والوں کی تالیف قلب فرماتے۔ انھیں مانوس کرتے ،متوحش نہ کرتے۔ نفرت پیدا نہ کرتے بلکہ الفت ومحبت پیدا کرتے۔ ہر قوم کے معزز اور سر برآوردہ لوگوں کا عزت واکرام فرماتے۔ قوموں پر اپنی طرف سے امیر نامزد فرماتے۔ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے۔ لوگوں کو ایک دوسرے سے احتیاط کی تلقین کرتے اور خود بھی محتاط رہتے۔ (لیکن اس احتیاط پسندی کے باوجود) خندہ پیشانی اور خوش خلقی کے رویے پر گامزن رہتے اور کسی کو اس سے محروم نہ کرتے۔ دوستوں کی خبر گیری فرماتے ،لوگوں کے حالات اور آپس کے معاملات کی تحقیق فرماتے اور اصلاح طلب امور کی اصلاح فرماتے۔ اچھی بات پر ملاقاتیوں کی تحسین فرماتے اور بری باتوں کی برائی واضح کر کے زائل فرماتے۔ آپ کے ہاں ہر کام خصوصی نظم وترتیب سے تکمیل پاتا۔ امر حق میں کبھی کوتاہی نہ کرتے اور نہ ہی حد سے تجاوز فرماتے۔ آپ کی نظروں میں افضل وہ تھا جو دوسروں کی خیر خواہی کا طلب گار ہوتا۔

آپ کے نزدیک بڑے درجے والا وہ تھا جو مخلوق کی غم گساری کرنے والا ہوتا اور انسانوں کی مدد و تعاون کرنے میں زیادہ حصہ لینے والا ہوتا۔ سیدنا حسین کا بیان ہے کہ میں نے اپنے ابا جان سے حضور ﷺ کی مجلس کے حالات دریافت کیے تو انھوں نے فرمایا: آپ ﷺ کی نشست و برخاست سب اللہ کے ذکر کے ساتھ مزین ہوتی تھی۔ جب کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں تشریف فرما ہو جاتے اور اس بات کی تعلیم دیا کرتے کہ جہاں جگہ ملے بیٹھ جایا کرو۔ کسی ساتھی کے سر کو پھلانگ کر آگے بڑھنے کی کوشش نہ کیا کرو۔ بہر حال آپ ﷺ جہاں بھی تشریف فرما ہوتے

لوگوں کی توجہ کا مرکز ٹھیرتے۔مجلس میں موجود ہر شخص کا حق ادا فرماتے۔ ہر بیٹھنے والا یہی سمجھتا کہ آپ ﷺ مجھ پر سب سے زیادہ توجہ فرما رہے ہیں۔کوئی آدمی آپ سے جو مانگتا آپ اسے عنایت فرما دیتے یا نرمی سے انکار کرتے ۔آپ ﷺ کی خوش خلقی اور خندہ پیشانی سب کے لیے عام تھی۔ آپ ﷺ سب سے بمنزلہ شفیق باپ کے تھے اور ہر آدمی (اولاد کی مانند) آپ کی نظروں میں برابر تھا۔حسب نسب کو آپ کے ہاں کوئی بڑائی حاصل نہ تھی۔آپ کی مجلس،علم کی مجلس تھی۔حیا کی مجلس تھی ۔صبر و امانت داری کی مجلس تھی ۔نہ شور وغل نہ کسی کی عزت و آبرو اچھالی جاتی ۔نہ لوگوں کے عیبوں ،لغزشوں اور غلطیوں کو اچھالا جاتا۔ہر آدمی دوسرے شخص کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آتا۔ بڑوں کی تعظیم کی جاتی اور چھوٹوں پر شفقت کہ یہی آپ ﷺ کی تربیت تھی ۔فضیلت صرف تقویٰ کو حاصل تھی۔آپ ﷺ کی مجلس میں مسافر کی حفاظت اور خدمت کی جاتی اور اہل حاجت کو خود پر فوقیت دی جاتی۔

(شمائل ترمذی)

ہمارے ہاں مذہبی طبقات دین کو جس طرح پیش کرتے ہیں اُس میں ایک طرح کی کرختگی پائی جاتی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے مذہب، نام ہی ہے سختی، پابندی اور آدم بیزاری کا۔ بیشتر مذہبی لوگ اپنے قریبی ماحول اور قریبی لوگوں کے لیے بجائے رحمت کے زحمت بنے ہوتے ہیں۔ یہ کرو، یہ نہ کرو، یوں اٹھو، یوں بیٹھو، ان کا تکیہ کلام ہوتا ہے۔ ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ، ہر وقت غصہ جھنجھلاہٹ اور عدم التفات ان لوگوں کا وطیرہ بن چکا ہوتا ہے۔ بار ہا دیکھا گیا ہے کہ ایک آدمی اچھی بھلی شگفتہ نرم زندگی گزار رہا ہوتا ہے کہ ایک دم معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی آدمی بن گیا ہے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ شفیق ہو جاتا۔ پہلے سے زیادہ نرم ہو جاتا اور معاشرے اور ماحول کے لیے پہلے سے زیادہ فائدہ منداور سکون آور بن جاتا۔ لیکن نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ اب اُس کا رویہ پہلے سے زیادہ سخت اور درشت ہو جاتا ہے۔ بچے اس کے مذہبی روپ سے ڈرنے لگتے ہیں اور اہل محلّہ اس کے رویے سے تنگ پڑ جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ چند در چند غلط فہمیوں کا نتیجہ ہوتا ہے جو ہماری مذہبی دنیا میں رائج ہو چکی ہیں۔ تقویٰ کا مصنوعی خول ہوتا ہے جو ان مقدس لوگوں نے اپنے اوپر چڑھا رکھا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں عام لوگوں کے لیے شفقت، رافت، اخلاص و محبت، دلسوزی اور رحمدلی کے جذبات اپنا اظہار نہیں کر پاتے۔ البتہ گروہی اور مسلکی کارکنوں میں کسی حد تک باہمی التفات پایا جاتا ہے۔ مسکراہٹ، قہقہہ، گرم جوشی اور اظہار خوشی کے دیگر مظاہر مفقود نظر آتے ہیں۔ ہم اکثر سوچتے رہتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ویسے تو مذہبی طبقات پر ہی کیا موقوف، یہی رویہ اور یہی بیماریاں کم وبیش دیگر لوگوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ طبائع میں سنجیدگی اور وقار کا ہونا کوئی عیب نہیں اور نہ ہی

حالات کے باعث وقتی طور پر معاملات میں نیم دلی اور بیزاری کا پایا جانا کوئی قابل گرفت چیز ہے لیکن اگر عمومی رویہ کرخت ہو، تقوی کا خول چڑھا ہوا ور انسان ہر وقت بندوں کے عیوب پر ہی نگاہ رکھے ہو۔ یہ چیز بہر حال لائق مذمت ہے۔ مذہبی لوگوں کا یہ رویہ اور دیگر طبقات کا۔ اس کی تائید خیر البشر ﷺ کی ذات والا صفات واسوہ حسنہ سے نہیں ہوتی۔ آیئے ذیل میں اس پہلو سے نقش محبوب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

□□□□□□□□

گھر میں:

سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے چپل خود درست فرما لیا کرتے تھے۔ اپنی کپڑے خود سی لیتے تھے، اپنے گھر میں اسی طرح کے سب کام کاج خود ہی کر لیا کرتے تھے جس طرح تم سب لوگ کر لیتے ہو۔ اور فرماتی ہیں کہ آپ بھی ایک بشر ہی تھے، اپنے کپڑوں کی جوئیں تلاش کر لیتے، اپنی بکری کا دودھ نکال لیتے اور اپنی ضروریات کو خود ہی انجام دیتے۔

(ترجمان السنہ، جلد سوم ص ۲۳۶۔ بحوالہ ترمذی)

□□□□□□□□

سیدنا اسود فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا؟
آنحضرت ﷺ اپنے گھر میں آ کر کیا کیا کام کرتے تھے۔ انھوں نے فرمایا: آپ اپنے اہل خانہ کی ضروریات پوری کرتے، مگر جہاں نماز کا وقت آتا بس اسی وقت نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

(ترجمان السنہ، جلد سوم ص ۲۳۷۔ بحوالہ ترمذی)

□□□□□□□□

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ حضورﷺ اپنے گھر میں کس خوبصورت طریقے سے رہا کرتے تھے۔گھر کے عام کام کاج بھی کرتے اور اہل خانہ سے شگفتہ بات چیت بھی کرتے رہتے۔گھر کے کسی کام کو کرنے میں عار محسوس نہ کرتے،اپنے گھر میں،اپنے ہی کام کرنا۔واہ سبحان اللہ!
کیسی خوبصورت تعلم ہے۔یہ بھی میرے آقا کی سنت ہے۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

گھر سے باہر:

سیدنا اسید بن حضیر کہتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی نے جن کے مزاج میں ظرافت تھی ایک دن اپنی بات کرتے ہوئے بیان کیا کہ ایک بار میں لوگوں کو ہنسا رہا تھا،حضورﷺ بھی ہمارے درمیان موجود تھے۔اسی اثنا میں آپﷺ نے بے تکلفی سے ایک لکڑی میری کوکھ میں چبودی۔تو میں نے کہا کہ میں تو اس کا بدلہ لوں گا۔آپﷺ نے فرمایا:اچھا لے لو۔میں نے کہا:آپ نے تو قمیض پہنی ہوئی ہے کہ جب میرا جسم ننگا تھا۔تب آپﷺ نے اپنی قمیض اٹھادی پھر کیا تھا وہ آپ سے لپٹ گئے اور آپ کے پہلو کے بوسے لینے لگے۔ساتھ ہی کہتے کہ میری دیرینہ تمنا تھی کہ میں آپﷺ کے جسم کا بوسہ لوں۔

(ترجمان السنہ،جلد سوم ،ص ۳۹۹۔بحوالہ ابوداؤد)

❑❑❑❑❑❑❑❑

اسی طرح سما بن حرب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن سمرہ سے پوچھا کیا آپ رسول اللہﷺ کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔انھوں نے کہا:ہاں بہت مرتبہ۔آپﷺ جس جگہ صبح کی نماز پڑھتے تو طلوع آفتاب سے پہلے وہاں سے نہ اٹھتے۔اور جب سورج نکل آتا تو آپ اٹھ جاتے۔اس دوران آپﷺ صحابہ کرام کے ساتھ باتوں میں مشغول رہتے،زمانہ جاہلیت کی باتوں کا تذکرہ

کرتے اور ہنستے مسکراتے رہتے۔ حضور ﷺ بھی ہمارے ساتھ مشغول رہتے اور تبسم فرماتے جاتے۔

(مسلم۔ کتاب الفضائل)

خارجہ بن زید بن ثابت سے روایت ہے کہ چند لوگ ان کے والد سیدنا زید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ہمیں رسول اللہ ﷺ کی کچھ باتیں سنائیں۔ انھوں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کا پڑوسی تھا۔ جب آپ ﷺ پر وحی آتی تو آپ مجھے بلا بھیجتے اور میں اس وحی کو لکھ لیتا۔ جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپ ﷺ ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو جاتے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تب آپ بھی ہمارے ساتھ آخرت کا ذکر فرمانے لگتے۔ پھر جب ہم کھانے پینے کا ذکر کرتے تو آپ اس میں بھی شریک ہوتے۔ یہ ساری باتیں حضور ﷺ کی ہیں جن کو میں تم سے بیان کر رہا ہوں۔

(ترجمان السنہ، جلد سوم ص ۲۳۶۔ بحوالہ ترمذی)

□□□□□□□□

ابو حازم روایت کرتے ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے کچھ بات کی تو وہ خوف سے لرزنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے بھائی! گھبراؤ مت۔ میں کوئی بادشاہ تو نہیں، میں تو ایک قریشی عورت کا لڑکا ہوں، جو سوکھا ہوا گوشت بھی کھا لیتی تھی۔

(ترجمان السنہ، جلد سوم ص ۲۳۶۔ بحوالہ ترمذی)

فائدہ:

میں قربان جاؤں پیارے رسول ﷺ کے اس خوبصورت نمونہ زندگی پر!

ان احادیث سے واضح ہوا کہ سرورِ عالم ﷺ گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی نہایت سادگی، بے تکلفی اور شریک کار کے طور پر زندگی گزارتے تھے۔ رکھ رکھاؤ، ہٹو بچو، تصنع اور بناوٹ اور بے جا غرور و پندار سے کوسوں دور تھے۔ آپ ﷺ کے اردگرد ماحول شگفتہ شگفتہ رہتا تھا، آپ احباب کی باتوں میں شریک رہتے، چھوٹے چھوٹے گھریلو کاموں میں کوئی عار محسوس نہ کرتے، اہل خانہ کا ہاتھ بٹانا اور دوستوں کے ساتھ گفتگو میں شریک رہنا سنت پیغمبر ہے۔ یہ تقویٰ ہے بلکہ یہی تقویٰ ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قرون اولیٰ کے لوگ کس طرح چاہت و محبت سے حضور ﷺ کے صحابہ سے آپ ﷺ کا تذکرہ سنتے تھے۔ اس کتاب کے اس ناچیز راقم کا بھی مشن یہی ہے کہ سیدی خیر البشر ﷺ کا تذکرہ بھی ہماری محفلوں میں ہوتا رہے اسی جذبہ اور مشن کا نام یہ کتاب ہے۔

□□□□□□□□

سیدنا ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ:

ایک سیاہ عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، یا وہ نوجوان مرد تھا (راوی کو شک ہے) ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے چند روز اس کو نہ دیکھا تو اس کے بارے میں صحابہ سے دریافت فرمایا۔ لوگوں نے کہا اس کا تو انتقال ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے مجھ کو خبر کیوں نہیں کی۔ روای کہتا ہے کہ گویا لوگوں نے ایسی عورت کی موت کا معاملہ بہت معمولی سمجھا تھا (کہ حضور ﷺ کو اس کی اطلاع کی جائے) اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس کی قبر پر لے چلو۔ چنانچہ آپ ﷺ اُس کی قبر پر تشریف لے گئے آپ ﷺ نے اس کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی اس کے بعد ارشاد فرمایا: ان قبروں میں تاریکی در تاریکی تھی، اندھیرا در اندھیرا تھا۔ میری اس نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو روشن اور منور فرما دیا ہے۔

(ترجمان السنہ، جلد سوم ص ۲۷۰۔ بحوالہ بخاری، مسلم)

□□□□□□□□

فائدہ:

ملاحظہ کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتنی شان وعظمت کے مالک ہونے اور کارِ رسالت میں بے پناہ مصروفیت کے باوجود، چھوٹی چھوٹی باتوں کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ مسجد میں جھاڑو دینے والوں کی غیر حاضری کو بھی محسوس فرمایا اور اس کے بارے میں استفسار فرمایا۔ جب معلوم ہوا کہ وہ فوت ہو چکی ہے تو اطلاع نہ کیے جانے پر اظہار ناراضگی فرمایا: سبحان اللہ!

پھر، دیکھئے کہ تاجدارِ رسالت ﷺ اپنی تمام تر علو مرتبت سمیت اس مسکین اور غریب جھاڑو دینے والی کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کی مغفرت کے لیے دُعا بھی فرمائی۔

کیا سہانے مقدر تھے اس غربت عورت کے!!

آپ کے اس عمل سے، حضور ﷺ کی عظمت کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور سرکار ﷺ کے طرز زندگی کے کئی گوشے نمایاں ہوتے ہیں اور یہ سبق ملتا ہے کہ آس پاس رہنے والا خواہ کتنا ہی حقیر کام کیوں نہ کرتا ہو کی خبر رکھنا، اس کا دھیان کرنا اور معمولات سے اس کی غیر حاضری تک کو محسوس کرنا اسوہ پیغمبری ہے۔

□□□□□□□□

سفر میں:

حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ بدر کے سفر کے دنوں میں، ہماری حالت یہ تھی کہ ہم میں ہر تین آدمیوں کے لیے ایک اونٹ تھا، جس پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ حضرت ابو الیابہ اور حضرت علی بن ابو طالب رسول اللہ ﷺ کے اونٹ شریک تھے۔ راوی کا بیان ہے کہ جب حضور ﷺ کی پیدل چلنے کی باری آتی تو دونوں شریک صحابہ عرض کرتے کہ آپ سوار رہیں ہم پیدل چلتے ہیں۔

توجہ کیجئے اس موقع پر آپ ﷺ کیا جواب دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ: تم دونوں مجھ سے زیادہ طاقتور تو نہیں ہو اور نہ ہی میں اجر و ثواب سے مستغنی ہوں۔

کیا ہی خوبصورت جواب ہے، ہنستا مسکراتا، شگفتہ شگفتہ!!

قربان جاؤں، نبی رحمت کے عدل و رحمت پر!!

جلیل القدر صحابی حضرت جابر بن عبداللہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ سے واپسی پر میرا اونٹ کچھ سست پڑ گیا اور میں قافلے سے پیچھے رہ گیا۔ اتنے میں حضور ﷺ مجھ سے آ ملے اور پوچھا جابر اونٹ کو کیا ہوا ہے؟ میں نے عرض کی شاید تھک گیا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اسے بٹھا اور نیچے اتر آؤ۔

آپ ﷺ نے اپنا اونٹ بھی بٹھا دیا اور نیچے تشریف لا کر جابر بن عبداللہ کے اونٹ کو اپنے عصا مبارک سے ٹھوکر لگائی اور دُعا فرمائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سست اونٹ اب ہوا کی رفتار سے دوڑنے لگا۔

اب حضرت جابر اور سیدی محمد رسول اللہ ﷺ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جابر یہ اونٹ مجھے دے دو ہم اسے قیمتاً خریدیں گے۔

سیدنا جابر قدرے ہچکچائے لیکن حضور ﷺ کا اصرار جاری رہا۔

تب حضرت جابر نے کہا ٹھیک ہے مگر آپ اس کی کتنی قیمت دیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک درہم۔

حضرت جابر نے عرض کی: یہ تو بہت کم ہیں۔ واللہ اس میں سراسر نقصان ہے آپ قیمت کچھ بڑھائیں۔

سفر جاری ہے۔ دونوں دوست اپنے اپنے اونٹوں سوار منزل کی طرف جا رہے تھے۔

پھر آپ ﷺ نے قیمت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔

کرتے کرتے ایک اوقیہ تک دام لگا دیئے۔(ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے)۔

حضرت جابر یہ قیمت سن کر خوش ہو گئے اور کہا ٹھیک ہے اب یہ اونٹ آپ کا ہوا۔

ذرا ملاحظہ کیجئے، آپس میں کتنی دوستی اور بے تکلفی کی فضا ہے۔سفر بھی کٹ رہا ہے اور عام دنیاوی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔

کیا خوبصورت لمحات ہوں گے۔

یہ دنیاوی باتیں اور ہنسی مذاق کیا تقویٰ کے خلاف ہے۔

نہیں قطعاً نہیں، کم از کم، خیر البشر کا اسوہ تو یہی بیان کر رہا ہے۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد، حضور اقدس ﷺ پھر گویا ہوئے۔

جابر بن عبداللہ کی سماعتوں کی کیا ن شان تھی! آج قسمت کی دیوی اُن پر کس قدر مہربان تھی۔

رسول رحمت ﷺ نے اپنے اس نوجوان دوست سے پوچھا؟

جابر کیا تم نے شادی کر لی ہے۔

حضرت جابر نے کہا: ہاں یا رسول اللہ ﷺ

نبی اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا: کنواری سے یا شوہر دیدہ سے۔

حضرت جابر نے عرض کی: شوہر دیدہ سے

نبی مہربان نے فرمایا: کسی کنواری سے شادی کی ہوتی وہ تم سے لطف اندوز ہوتی تم اس سے کھیلتے!!

کیا شان رفاقت تھی! کیسی بے تکلفی ہے اور کیا عمدہ دل لگی ہے۔

حضرت جابر نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ میں آپ پر قربان جاؤں بات یہ تھی کہ ابا جان جنگ اُحد میں شہید ہو گئے تھے، میری 9 جوان بہنیں ہیں جن کا میں اکیلا بھائی ہوں۔اس لیے سوچا کہ ایسی جہاندیدہ اور عمر رسیدہ بیوی لاؤں بھلے میرے ارمان نکلیں نہ نکلیں میری بہنوں کی دیکھ بھال اور پرورش، تربیت اور نگرانی تو ٹھیک ہو گی۔واہ سبحان اللہ!

ایک پاکباز صحابی کی کیا ہی عمدہ اسکیم تھی۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم نے درست فیصلہ کیا ہے خدا تمہیں اپنی بیوی سے خوش رکھے۔

مدینہ واپسی پہنچ کر حضرت جابر نے ساری گفتگو اپنی بیوی کو بتائی۔

وہ نیک خاتون کہنے لگی، ان باتوں کو یاد رکھو اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری میں مستعد رہو۔

سبحان اللہ! بیوی نے کیا ہی اعلیٰ نصیحت کی۔

صبح ہوئی تو جناب جابر اپنا اونٹ لے کر در اقدس پر حاضر ہو گئے۔

سرور کائنات اپنے کاشانہ مبارک سے باہر تشریف لائے تو پوچھا یہ اونٹ کس کا ہے؟

حضرت جابر حاضر خدمت ہو کر عرض گزار ہوئے حضور یہ اونٹ آپ کا ہے اور یہ غلام لایا ہے۔

آپ ﷺ نے تبسم فرمایا؛ اور اپنے میر منشی سیدنا بلال کو حکم دیا کہ جابر کو ایک اوقیہ رقم دے دو، محسن انسانیت کی شان سکندری ملاحظہ فرمائیں، جب جابر جانے لگے تو فرمایا: اور برادر زادے یہ اونٹ بھی لے جاؤ اور اس کی قیمت بھی یہ دونوں تمھارے ہیں۔

لاکھوں سلام آپ پر، کروڑوں درود آپ پر

اے رسول مہربان: اے ساتھیوں کے بے تلف ساتھی۔

اللھم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم علیہ

خاکسار ابھی ہائی سکول میں ہی تھا کہ جب سرورِ عالم کا یہ فرمان ذیشان سنا کہ ”تم میں سے اُس وقت تک کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں (ﷺ) اُسے اُس کے والدین آل اولاد اور دنیا جہان سے محبوب نہ ہو جاؤں“۔ اس کچی عمر میں ہی ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ محبت رسول کیا ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ وہ دن اور آج کا دن زندگی گزر چلی اور یہی سوال ہنوز جواب طلب ہے۔ اب بھی یہ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ آیا ہم سے محبت رسول کے تقاضے پورے ہو رہے ہیں یا نہیں۔ کیا صرف آپ کی نعتیں پڑھنا، آپ سے محض عشق کے دعوے کرنا، محبت ہے یا آپ ﷺ کے احکامات و فرامین کو تسلیم کرنا اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کی محض پیروی کرنا آپ سے محبت ہے؟؟ اطاعت کیا ہے اور محبت کیا ہے؟ کیا یہ دونوں مترادف ہیں یا مختلف؟ یہ اس لیے کہ میرے آقا، پیارے رسول ﷺ کا یہ ارشاد مبارک موجود ہے کہ ”تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ میری لائی ہوئی ہدایت کا اتباع نہ کرے“۔ یہ ایک اندرونی جذبہ ہے، یہ دل کی

خاص کیفیت کا نام ہے۔محبت کرنے والا ضرور اطاعت محبوب کا راستہ اختیار کرے گا،لیکن اطاعت کرنے والے کے اندر ضروری نہیں کہ مطاع کی محبت بھی ہو۔لہٰذا ان دونوں کی الگ الگ حیثیت ہے۔اطاعت کسی حد تک یا بڑی حد تک محبت کا ایک مظہر ہو سکتی ہے لیکن محبت کا یہ واحد مظہر قطعاً نہیں۔

اطاعت،بہر حال نظر آنے والی ایک مادی چیز کا نام ہے جب کہ محبت ایک روحانی قلبی اور اندرونی تعلق کا نام ہے۔محبت کے گوناں گوں مظاہر ہو سکتے ہیں۔اس کو نہ تو ماپا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے کسی مظہر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔یہ ہر دل زندہ کا اپنا اپنا معاملہ ہے اور ہر فرد کا اپنا اپنا پیمانہ!کسی کو کسی سے محبت کب ہوتی ہے؟جب وہ اس کے کسی کمال سے متاثر ہوتا ہے۔یا جب وہ کسی کے کسی عظیم احسان کے نیچے دبا ہوتا ہے۔چیزوں کی افادیت اور ان کی جمالیاتی کشش ہی ان کے لیے کسی دل میں چاہت و محبت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔اس اصول سے دیکھیں تو جانیں کہ صرف اور صرف حضور اکرم ﷺ ہی ان دونوں وجوں کے باعث محبتوں اور چاہتوں کا محور بننے کے لائق ہیں۔یعنی وہ حسن و جمال میں یکتا اور صفات و کمالات میں اکمل ہیں۔اور ہم پر ہدایت کے دروازے کھولنے والے ہمارے محسن اعظم بھی ہیں۔اس لیے تمام تر دلی جذبات،ہماری ذہنی وابستگی اور روحانی تعلق کے مرجع و محور کی حیثیت انھی کی ذات والاصفات کو حاصل ہے۔

لیکن اس کا اظہار کیسے ہو؟آپ ﷺ کے فرامین مقدسہ کی اطاعت کر کے بھی اپنی محبت کا اظہار ہوتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ محبت کے حق کی ادائیگی کے لیے کچھ اور بھی مطلوب ہے۔

یہ کچھ اور کیا ہے؟

اس مشکل سوال کے جواب کے لیے صحابہ کرام کی پاک محفل میں چلتے ہیں۔

یہ لوگ رسالتمآب ﷺ کے اولین ماننے والے،

آپ ﷺ سے اولین محبت کرنے والے،

آپ ﷺ کے اولین اطاعت گزار ہیں۔

اس لیے وہی امت کے لیے نمونہ ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوایوب انصاری کو شرف میزبانی بخشا۔سیدنا انصاری کا مکان دومنزلہ تھا۔حضور ﷺ نے نچلی منزل میں اپنا قیام پسند فرمایا۔حضرت ابوایوب انصاری اوپر والی منزل میں منتقل ہوگئے ۔وہ کہتے ہیں کہ پہلی ہی رات کو جب ہم میاں بیوی بستر پر لیٹنے لگے تو ایکدم ہمیں خیال آیا کہ نیچے اللہ کے رسول محو استراحت ہیں اوراوپر ہم!! یہ ہم سے کیا کوتاہی ہوگئی ،آقا نیچےسوئیں اورغلام اوپر۔یہ ہم سے کیا کوتاہی ہوگئی۔آقا نیچےسوئیں اورغلام اوپر!!

وہ کہتے ہیں یہ خیال آتے ہم اُٹھ کر بیٹھ گئے اور کمرے کے ایک کونے میں سرک کرساری رات تڑپتے ہوئے گزاری۔صبح ہوئی تو حضور ﷺ سے عرض گزار ہوئے کہ یارسول اللہ ﷺ یہ ہم سے نہیں ہوسکتا کہ جس کمرے میں آپ تشریف فرماہوں اس کی اوپر والی منزل میں ہم سوئیں۔براہ کرم آپ اوپر والی منزل میں تشریف لے چلیں اورہم نیچے قیام کریں گے۔

آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: دراصل میں یہاں نیچے آرام سے ہوں آپ لوگ اطمینان وسکون کے ساتھ اوپر رہیں۔لیکن وہ مسلسل اصرارکرتے رہے۔حضور ﷺ کے بار بارسمجھانے اورتسلی دینے پر ہی وہ آخرکاراوپر والے پورشن میں رہنے کے لیے رضامند ہوئے۔

یہ کیا تھا؟ یہ ادب واحترام،محبت اورلگاؤ کاایک مظہر تھا۔اندرکااحساس تھا کہ شاید ہم سے بےادبی و گستاخی ہورہی ہے کہ بظاہرتو یہی ہے حضور نیچے سورہے ہیں اورہم اوپر۔اور یہ صورت ایک جانثار کیسے برداشت کرسکتا ہے۔

سیدنا ابوایوب نصاری انھی دنوں کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی خدمت عالیہ میں ہم کھانا بنا کر پیش کرتے تھے،آپ ﷺ نے جتنا کچھ تناول فرمانا ہوتا وہ لے لیتے ،باقی برتن میں موجودرہتا۔ آپ ﷺ کا بچاہواکھانا ہم سب گھر والے بڑے شوق سے کھاتے اوربرتن سے اُس جگہ سے لینے کی کوشش کرتے جہاں پرآپ ﷺ کی انگلیوں کےنشانات ہوں۔

یہ کیا ہے؟محبت وقلبی تعلق کااظہار!!

یہ کوئی اطاعت واتباع کا معاملہ نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے برتن میں جس جگہ کھانا کھانے کے لیےانگلیاں لگائی ہوتیں وہاں سے کھانا کوئی

اللہ کا حکم تو نہ تھا بلکہ محبوب کے پس خوردہ کو بڑی چاہت اور شوق سے کھانا صرف محبت ہی کا اظہار تھا۔ کیا ہی خوش قسمت تھے وہ لوگ جن کے حصہ میں یہ سعادتیں آئیں۔

□□□□□□□□

سیدنا عروہ بن مسعود ثقفی ابھی دولت ایمان سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ جب وہ صلح حدیبیہ کے زمانے میں قریش مکہ کی طرف سے سفیر بن کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے تھے۔ واپس جا کر قریش مکہ کے سامنے، عاشقان رسول کے طرز محبت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ عروہ بن مسعود کہتے ہیں کہ: میں بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں، ایران و روم کے دربار دیکھے ہیں۔ ان کا کروفر شان و عظمت کی ملاحظہ کی ہے۔ لیکن جو عزت و احترام، پیار و محبت ،عقیدت و وارفتگی محمد ﷺ کے ساتھیوں میں ان کے لیے دیکھی ہے وہ کہیں نہیں دیکھی۔ سیدنا محمد ﷺ جب بولتے ہیں تو لوگوں پر سکوت طاری ہوتا ہے۔ وہ حکم دیتے ہیں تو لوگ تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ تھوکتے ہیں تو کوئی نہ کوئی آگے بڑھ کر اسے ہاتھوں پہ لیتا ہے اور اپنے جسم پر مل لیتا ہے۔ اُن کے وضو کے پانی سے برکت لینے والے اسے نیچے نہیں گرنے دیتے۔ صحابہ کرام کا یہ عمل حضور ﷺ سے ان کی بے پناہ محبت و عقیدت کا مظہر ہے۔ وگرنہ تو یہ اللہ کا حکم ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے انھیں تھوک کو اپنے جسم پر ملنے کا کوئی حکم دیا تھا اور نہ ہی وضو کے پانی کو حاصل کرنے کا کوئی آرڈر جاری ہوا تھا۔

یہ سب محبت کی باتیں ہیں بھائی، عقل ہے محو تماشا ابھی!!

آپ کا صحابہ کرام کو منع نہ کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ عشق رسول کے مظاہر گوناں گوں ہو سکتے ہیں۔ ان پر نہ تو پابندی لگائی جا سکتی ہے اور نہ ہی اسے کسی خاص طریقے تک محدود کیا جا سکتا ہے۔ ہاں البتہ جو چیز دین کے اعتبار سے نقصان دہ ہو سکتی تھی اس کا سد باب کرنے میں اور اس سے روک دینے میں آپ ﷺ نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مثلاً ایک بار جب ایک صاحب نے یہ اجازت چاہی کہ جس طرح روم و ایران کے درباروں میں بادشاہوں کو سجدہ کیا جاتا ہے وہ بھی آپ کو

تعظیماً سجدہ کرنا چاہتے ہیں تو اُن کی اس تجویز کو رسول اللہ ﷺ نے سختی سے رد کر دیا اور فرمایا سجدہ صرف اللہ ہی کو بجالایا جاسکتا ہے۔ یہ تو عبادت کا مظہر اتم ہے اور عبادت تو صرف اللہ کی ہوتی ہے محبت اور عبادت میں فرق کرنا لازم ہے۔

□□□□□□□□

حضور ﷺ میں آپ پر قربان، سے محبت مطلوب ہے نہ کہ آپ کی عبادت!

سیدنا ابو ہریرہ کہتے ہیں ایک بار (حضور ﷺ کی وفات کے بعد) میں مدینہ آیا تو مجھے حضرت عبداللہ بن سلام ملے۔ کہنے لگے میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں تم کو اس پیالہ میں پلاؤں گا جس میں آنحضرت ﷺ نے پیا تھا۔ اور میرے گھر میں اُس جگہ نماز پڑھنا جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔ یہ سن کر میں اُن کے ساتھ ہولیا۔

(بخاری، کتاب الاعتصام)

□□□□□□□□

کیا خوش قسمت لوگ تھے جن کے پاس رسول اللہ ﷺ کی نشانیاں تھیں۔

وہ ایک دوسرے کو ان کی بنا پر اپنے ہاں آنے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے پیالے میں پینا اور آپ ﷺ کی جائے نماز پر نماز پڑھنا کوئی حکم رسول نہ تھا کہ جس کی اطاعت کی جائے بلکہ وہ محض محبت رسول تھی۔

□□□□□□□□

سیدنا انس بن مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو مدینہ کے عوام (برکت لینے کے لیے) پانی سے بھرے ہوئے اپنے برتن لے کر آتے تھے، آپ ﷺ ہر برتن میں اپنا ہاتھ ڈبو دیتے، بسا اوقات سرد صبح کو بھی یہ واقعہ ہوتا اور آپ اپنا ہاتھ ان میں ڈبو دیتے۔ (یعنی

سردی کے باعث بھی انکار نہ کرتے)۔

(مسلم۔کتاب الفضائل)

حضرت انس ہی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا ایک حجام آپ ﷺ نے سر مونڈ رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب آپ کے ارد گرد کھڑے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ کا کوئی بھی بال زمین پر نہ گرے بلکہ وہ آپ کے ہر بال کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔

(مسلم۔کتاب الفضائل)

سیدنا انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے اور سو گئے آپ ﷺ کو پسینہ آیا میری والدہ ایک شیشی لے آئیں اور رسول اللہ ﷺ کا پسینہ پونچھ پونچھ کر اس میں جمع کرنے لگیں۔ نبی اکرم ﷺ بیدار ہوئے تو فرمایا: اے اُم سلیم یہ کیا کر رہی ہو۔انھوں نے کہا آپ کا یہ پسینہ ہے جس میں ہم اپنی خوشبو ملا لیں گے اور یہ سب سے اچھی خوشبو ہے۔

(مسلم۔کتاب الفضائل)

سیدنا انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ کا رنگ سرخ وسفید اور چمکدار تھا،اور آپ ﷺ کا پسینہ موتیوں کی طرح چمکتا تھا،جب آپ ﷺ چلتے تو آگے کو جھک کر چلتے تھے،اور میں نے کسی دیباج وحریر کو آپ ﷺ کے ہاتھ سے زیادہ ملائم نہیں پایا اور نہ ہی کسی مشک یا عنبر کو رسول اللہ ﷺ کے جسم کی خوشبو سے اعلیٰ پایا ہو۔

یہ کیا ہے؟حضورﷺ کا استعمال شدہ پانی، آپ ﷺ کا پسینہ مبارک، آپ کا لعاب دہن اور حضورﷺ کے بال حاصل کرنے اوران سے تبرک لینے کے کئی اور واقعات بھی صحابہ کرام سے ثابت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن لوگوں کی قسمت پر رشک آتا ہے۔

ہم کیا کریں؟

جو اپنے محبوب سے چودہ صدیاں دوری پر ہیں؟

ہم اُن سے محبت کا اظہار کیسے کریں؟

بلاشبہ آپ کے فرامین اور آپ کی احادیث اور آپ کا لایا ہوا نظام حیات موجود ہے آپ کی باتوں پر عمل تو کرنا ہی کرنا ہے، آپ کی اتباع سے تو انکار نہیں ہے لیکن آپ ﷺ سے شخصی اور ذاتی محبت اور لگاؤ کا اظہار کیسے ہو۔تمام تر بحثا بحثی سے ہٹ کر میرا تو اس دیہاتی کی ادا پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے جسے کل ہی میں نے حضورﷺ کے نام نامی اور اسم گرامی کے آنے پر عقیدت ووارفتگی سے اپنے ہی ہاتھوں کے انگوٹھے کو چومتے ہو دیکھا تھا۔وہ اور کر ہی کیا سکتا تھا۔وہ نہ تو شاعر تھا کہ اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتا،نہ تو وہ خطیب تھا کہ اپنی زبان کی ساحری سے ذکر حبیب کرتا،اور نہ ہی وہ ادیب تھا کہ زبان وادب کے موتی بارگاہ مصطفٰی میں لٹاتا۔وہ تو جو کر گیا سو کر گیا میں کیا کروں کہ میں تو ان پڑھ دیہاتی بھی نہیں۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

سیدنا انس بن مالک سے روایت ہے کہ:

ایک دن میں رسول اللہﷺ کی معیت میں باہر نکل رہا تھا کہ ہم نے مسجد کی چوکھٹ پر ایک آدمی کو بیٹھے دیکھا۔آپ ﷺ کو دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور عرض کی: یارسول اللہﷺ قیامت کب آئے گی؟

آپ ﷺ نے فرمایا: اور میاں، تو نے اس کی کیا تیاری کی ہے؟

اس پر وہ آدمی کچھ خاموش ہو گیا پھر عرض کی: یا اللہ اس کی کیا تیاری ہو سکتی ہے میں نہ تو زیادہ نفل پڑھتا ہوں، نہ ہی زیادہ روزے رکھتا ہوں اور نہ ہی میرے پاس صدقات وخیرات کی بھرمار ہے۔ایسے

میں قیامت کی کیا تیاری ہوسکتی ہے؟

پھر وہ بولا: ہاں حضور ﷺ البتہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت ضرور سرمایہ حیات ہے۔

رسول رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تم کو جس سے محبت ہوگی تم اسی کے ساتھ ہو گے۔

یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ آگے بڑھ گئے۔

سیدنا انس کہتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہم کو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے بڑھ کر اور کسی چیز سے خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ جس سے تم محبت کرتے ہو تم اس کے ساتھ ہی رہو گے۔

(مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب)

لاکھوں سلام آپ پر، کروڑوں درود آپ پر

اے رسول محبوب، اے محسن انسانیت، میں آپ پر قربان

میری آل اولاد آپ کے قدموں کی خاک پر واری

اللھم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم علیہ

سیدنا ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی، عموماً دائیں ہاتھ میں پہنتے، اس کا نگینہ ہتھیلی کی طرف رہتا، اس میں 'محمد رسول اللہ' کندہ کرایا گیا تھا۔ یہ خطوط پر مہر لگانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ گویا ایک طرح کی سرکاری مہر تھی۔ اس لیے آپ نے اور لوگوں کو منع فرما دیا تھا کہ کوئی شخص اپنی انگوٹھی پہ یہ حروف کندہ نہ کرائے۔ جب آپ اس کو نہ پہنتے تو حضرت معیقیبؓ اس کو سنبھالتے تھے۔ حضور ﷺ کے بعد یہ انگوٹھی سیدنا ابو بکرؓ کے پاس رہی، پھر سیدنا عمرؓ کے پاس رہی۔ ان ادوار میں بھی حضرت معیقیبؓ ہی انگوٹھی کے انچارج تھے۔ سیدنا عثمانؓ کے دور میں یہ انگوٹھی اریس کے کنویں میں گر گئی۔ یہ کنواں ایک باغ میں تھا۔ بڑی تلاش کرائی گئی لیکن نہ ملی۔ یہ کنواں مسجد قبا کے قریب تھا۔ ان سطور کا یہ عاجز راقم سن ۲۰۰۰ میں جب مدینہ حاضر ہوا تھا اور مسجد قبا کی زیارت کو گیا تو گائیڈ نے اس کنویں کی جگہ کی نشاندہی کی تھی۔ وہاں اس وقت ٹریفک چوک ہے اور کنواں والی جگہ پر چوک کے وسط میں سگنل سٹینڈ نصب تھا۔

لمعہ نور: 6 راستے اور گلیاں

وہ کیا خوبصورت گلیاں تھیں اور وہ کیا خوش قسمت لوگ تھے، کہ جن کے شب و روز محبوب خدا، سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بسر ہوئے تھے!!

میں قربان جاؤں، مدینہ طیبہ کی ان گلیوں اور شاہراہوں کے، جن پر فخر کائنات گامزن رہتے تھے۔ قربان جاؤں، جن ذروں کو آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا، جن راہوں پر آپ ﷺ چلتے تھے قربان جاؤں، آپ کی تعلیمات پر کہ ان رستوں اور گلیوں کے بھی حقوق مقرر فرمائے۔ اور اپنے ماننے والوں کو ان پر چلنے اور رہنے کے آداب سمجھائے۔ لاکھوں درود و سلام ہوں آپ ﷺ پر!!

یکے از جان نثاران محمد ﷺ سیدنا طلحہ بیان فرماتے ہیں کہ:

ایک دن ہم چند دوست مدینہ طیبہ کی ایک گلی میں، اپنے مکانوں کے سامنے، زمین پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ سید عالم محمد ﷺ گلیوں اور بازاروں کو رونق بخشتے ہماری طرف آ نکلے، ہمیں یوں بیٹھا دیکھ کر ہمارے پاس رک گئے اور استفسار فرمایا: کہ تمہیں یوں راستوں پر یوں مجالس منعقد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

گویا رسول اللہ ﷺ نے بات کو ناپسند فرمایا کہ شارع عام پر روزانہ محفل اور بیٹھک منعقد کی جائے۔

یہ منظر آج ہم اپنی گلیوں اور محلوں میں دیکھ سکتے ہیں۔لوگوں نے اپنے گھروں مکانوں اور دوکانوں کے باہر گلی بازار میں چارپائیاں ڈالی ہوتی ہیں۔راستہ تنگ کیا ہوتا ہے اور آنے جانے والوں کے لیے تکلیف کا باعث بن رہے ہوتے ہیں۔اور یہ سب کچھ عموماً بلاضرورت اور بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمارا دین کب برداشت کرتا ہے کہ آپ کسی دوسرے کے لیے تنگی اور تکلیف باعث بنیں۔لہٰذا خیر البشر ﷺ نے ارشاد فرمایا: راستوں میں بیٹھنے اور مجالس برپا کرنے سے اجتناب کرو۔

سیدنا طلحہ اور ان کے ہم نشینوں نے وضاحت کرتے ہوئے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ ہم یہاں کسی برے مقصد سے نہیں بیٹھے گھروں میں مردانہ حصہ الگ نہ ہونے کے باعث ہمارے لیے یوں راستوں میں بیٹھنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں۔ہم محض خوش گپیوں اور عام بات چیت میں مصروف تھے۔ہادی عالم ﷺ نے اپنے صحابہ کی اس وضاحت کو تسلیم کیا۔گویا بعض عوامل اور مجبوریوں کے باعث ایسا کیا بھی جا سکتا ہے۔گلیاں اور راستے دراصل انسانوں کی ضرورت ہوتے ہیں۔ان کا اصل مقصد تو بطور گزرگاہ کے استعمال ہونا ہے۔ان کی اس حیثیت کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔شاہرائیں کسی کی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ یہ سب کے لیے گزرگاہ کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے ان کی اس حیثیت کو برقرار رکھنا اور ان حقوق کی پاسداری کرنا سب کی برابر کی ذمہ داری ہوتا ہے۔خیر البشر ﷺ نے اپنے صحابہ سے ارشاد فرمایا:

اگر تم راستے کے استعمال پر مصر ہی ہو،یعنی راستے میں بیٹھنے کو کسی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے تو پھر اس کے حقوق ادا کرو اور اس کے آداب کا لحاظ کرو۔صحابہ نے دریافت کیا یارسول اللہ ﷺ راستے کے حقوق کیا ہیں؟ اس پر محسن انسانیت نے فرمایا: نظریں نیچی رکھو، حیادار اور عفت مآب خواتین کو مت گھورو، کیونکہ یہ شارع عام ہے یہاں سے خواتین نے بھی گزرنا ہوتا ہے اس لیے تم اپنی نگاہوں کی حفاظت کرو اور انھیں جھکا کر رکھو۔سورہ نور میں وارد حکم اس کی مطابقت میں ہے جس میں مسلمانوں کو راہ چلتے ہوئے اپنی نگاہ نیچی رکھنے کا حکم ہوا ہے۔شرم وحیا اور پردہ داری کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ مرد ہو یا عورت، گلی محلے میں چلتے ہوئے ایک دوسرے کو تاڑتے نہ رہیں۔اپنی نگاہوں کی حفاظت کریں۔

تکلیف دہ چیز کو دور کرو، یعنی راستے میں ایسی کوئی رکاوٹ ہے جس سے آنے جانے والوں کو تکلیف ہو رہی ہو یا تکلیف ہونے کا کوئی اندیشہ ہو تو اسے ہٹا دینا چاہیے۔ یہ راستے کا حق ہے۔ یعنی نہ صرف خود رکاوٹ نہیں بننا بلکہ کسی دوسری رکاوٹ کو ہٹانا ہے۔ ایک اور موقع پر ہادی عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ راستے میں پڑی ہوئی کسی تکلیف دہ جھاڑی کو ہٹا دینا، یا کسی رکاوٹ بننے والی اینٹ کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ اس سے یہ بات بھی اخذ کی جاسکتی ہے کہ راستوں کو بنانا اور سنوارنا بھی نیکی کے کام ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ ہر انسان کے ذمہ ہر دن جس میں سورج نکلتا ہے اپنے بدن کے ہر جوڑ کی طرف سے (اس کی سلامتی کے شکرانے میں) ایک صدقہ ادا کرے۔ تمہارا دو آدمیوں کے درمیان انصاف کر دینا بھی صدقہ ہے، کسی آدمی کو اس کی سواری پر بٹھانے یا اُس کا سامان اٹھا کر اس رکھوانے میں اس کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے۔ ہر قدم جو نماز کی طرف اٹھے وہ بھی صدقہ ہے اور راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔

(مسلم۔ باب صدقہ)

□□□□□□□□

اسی طرح ترمذی میں ہے کہ خیر البشر ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کی خوشی کی خاطر ذرا سا مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔ سلام کا جواب دینا، یعنی راہ سے گزرنے والوں سے لاتعلق نہ بیٹھیں، اُن کی اور اپنی سلامتی کی فکر میں رہیں اور اس فکر کے عملی اظہار کے طور پر آنے جانے والوں کو سلام کریں اور ان کے سلام کا جواب دیں، گویا آپ نے راہ پر مجلس برپا کی ہے تو عملاً یہ ثابت بھی کریں کہ اس سے کسی دوسرے کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جو دین عطا فرمایا ہے اُس میں ایک دوسرے کو سلام کی کرنے کی بہت اہمیت ہے۔

اچھی بات یا نیکی کی بات کرنا یا فرمایا کہ اچھی بات کا حکم دینا اور بری بات سے روکنا بھی راستے کا حق ہے۔ گویا راستے میں بیٹھے ہوئے آپ ایک پر اخلاص داعی اور اخلاق بھرے راعی کا کردار ادا

کریں۔ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی کو اچھی بات کہہ دینا بھی صدقہ ہے اور کسی برائی سے آگاہ کرنا اور اس سے روکنا بھی سجدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید الرسل ﷺ کا ماننے والا جہاں کہیں بھی ہو دوسروں کا خیر خواہ اور ان کی سلامتی کا طالب ہوتا ہے۔ یہی پیارے نبی ﷺ کی سنت ہے اس کی حتی المقدور کوشش ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ یا زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔ یہی سیدی خیر البشر کا پیغام ہے۔ بخاری شریف میں کم وبیش یہی مضمون سیدنا ابوسعید خدری سے روایت ہوا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم راستوں میں نہ بیٹھا کرو، ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ راستوں میں بیٹھنا ہماری مجبوری ہے۔ ہم وہاں بیٹھ کر اپنی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر بیٹھنا مجبوری ہی ہو تو پھر راستے کے حقوق بھی ادا کیا کرو۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ راستے کے حقوق کیا ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نگاہوں کو نیچا رکھنا، تکلیف دہ چیزوں کو راہ سے ہٹا دینا، سلام کا جواب دینا، نیکی کی نصیحت کرنا اور برائی روکنا۔

لاکھوں سلام آپ پر، کروڑوں درود آپ پر

اے رسول محبوب، اے محسن انسانیت، میں آپ پر قربان

اللھم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم علیه

لمعہ نور: 7 اللہ جمیل ویحب الجمال

اُم المومنین سیدہ عائشہؓ کا بیان ہے کہ: ایک دن کچھ صحابہ ہمارے دروازے پر تشریف لائے۔ آپ ﷺ ان سے ملنے کے لیے گھر سے باہر جانا چاہتے تھے۔ گھر میں ایک چھاگل پانی تھا۔ آپ ﷺ نے اس میں جھانک کر اپنی داڑھی مبارک اور مقدس بالوں کو سنوارنے لگے۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ آپ بھی ایسا کرتے ہیں۔ (یعنی اپنے بالوں کو سنوارتے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے بھائیوں سے ملنے جائے تو اپنے آپ کو تیار کر کے جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

کیا خوبصورت بات ہے!

اپنے آپ کو سنوارنا قطعاً خلاف تقویٰ نہیں!!

اپنے دوستوں سے ملنے یا گھر سے باہر تشریف لے جاتے ہوئے حضور اکرم ﷺ اپنے بال سنوارنے کے لیے پانی کو بطور آئینہ استعمال کرتے ہیں۔ گویا اپنے آپ کو سنوارنا، آئینہ دیکھنا، بالوں کو کنگی کرنا اور حتی الوسع خوبصورت نظر آنا اسوہ پیغمبر ہے۔ سنت رسول ہے۔ یہی تقویٰ ہے۔ یہی تذکیہ ہے اور یہی شرف آدمیت ہے۔ ہر وقت گندہ رہنا، صفائی سے دوری اختیار کرنے اور اپنی آرائش و زیبائش سے اجتناب کرنے میں ہرگز کوئی دینداری نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے دین نے تو صفائی سے بھی آگے

پاکیزگی اور طہارت کا تصور دیا ہے۔

□□□□□□□□

سیدنا عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ ایک آدمی چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کی جوتی اچھی ہو تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ جمیل (خوبصورت) ہے اور حسن سلیقہ سے محبت کرتا ہے۔ تکبر حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔

(صحیح مسلم۔ حدیث نمبر ۹۱)

□□□□□□□□

امام احمد کی روایت کردہ حدیث میں یہ شخص اس طرح عرض کرتا ہے کہ:

یا رسول اللہ ﷺ مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ میرے کپڑے دھلے ہوئے ہوں، میرے سر میں تیل لگا ہوا ہو، میری جوتی نئی ہو، اُس نے اسی طرح اور چیزیں بھی ذکر کیں۔ حتیٰ کہ اپنے چابک کی ڈوری اور اپنی جوتی کے تسمے کا ذکر بھی کیا اور پوچھا؟ یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ سب تکبر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں! یہ جمال ہے، اپنے آپ کو سنوارنا ہے، بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے لیکن تکبر حق کا انکار کرنا اور دوسروں کو حقیر جاننا ہے۔

رب کریم کی عنایت ہو، آدمی کے حالات اور اس کی حیثیت اجازت دیتی ہو، اسے اعلیٰ لباس میسر ہو اور اسے نفاست و نظافت سے رہنا نصیب ہو تو وہ ایسا ہی کرے، یہ کسی طور بھی غیر دینی عمل نہیں ہے۔ اور یہ طرز زندگی کسی طرح بھی خلاف تقویٰ نہیں ہے۔ سادگی اور کفایت شعاری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی گندہ رہے۔ بے ترتیبی اور بدنظمی کا نام فقر نہیں ہے۔ گھٹیا اور کمتر مال و اسباب پر کفایت کرنے کا نام مذہب نہیں ہے۔ سید البشر ﷺ کی تعلیمات میں کہیں بھی ترک دنیا کی ترغیب نہیں

ہے۔ بلکہ غرق دنیا ہونے کی نفی ہے۔ یہ تصور تقویٰ جس میں پراگندگیا ور ترک زینت کا حکم دیا گیا ہو تعلیمات نبوی کے خلاف ہے۔ ہمارا دین راہبانیت نہیں سکھاتا۔ دنیا اور اس کی زینت کو ترک کرنا نہیں سکھاتا۔ تقوی کسی مخصوص لباس، مخصوص روپ اور کسی مخصوص ماحول کو اختیار کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جس میں انسان اپنے کریم آقا کی عنایات پر شکر کے جذبات سے لبریز اس کی طرف سے آنے والی آزمائش پر صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔

نیکی سینے میں ہوتی ہے اور اس کی تصدیق عمل سے ہوتی ہے۔

دل صوفی ہونا چاہیے، تکبر غرور اور خود پسندی سے پاک دل ہی،

حقیقت میں تقویٰ اور زہد کی علامت ہے،

یہی وہ تعلیم ہے جو ان احادیث میں پیش کی گئی ہے۔

□□□□□□□□

حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ:

ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ ایک شخص کو دیکھا۔ جس کے بال غبار آلودہ اور پراگندہ و منتشر تھے۔ آپ ﷺ نے اس کو دیکھتے ہی فرمایا: کیا اس کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ اپنے بالوں کو سنوار سکے۔ اسی طرح ایک اور شخص کو دیکھا جو میلے کپڑے پہنے ہوئے تھا تو فرمایا: کیا اس شخص کو پانی میسر نہیں کہ اپنے کپڑے دھو سکے۔

□□□□□□□□

گویا رسول اللہ ﷺ کو یہ پسند نہ تھا کہ کسی سہولیات زیبائش حاصل ہوں اور پھر بھی وہ ان کو استعمال نہ کرے اور پراگندہ رہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا برتنے کے لیے بنائی ہے۔ اس کی چیزیں ہمارے استعمال کے لیے بنائی ہیں۔ ان کا ترک دین میں کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں۔ جس چیز کی نفی کی گئی ہے وہ دراصل دنیا اور اس

کے سازوسامان کو آخرت پر ترجیح دینا اور مال ودولت کے بل بوتے پر اپنے جیسے دیگر انسانوں کو کمتر جاننا۔

□□□□□□□□

مسلم کی روایت ہے کہ:

حضرت ابوالاحوص کے والد بیان کرتے ہیں کہ؛ ایک دن میں انتہائی معمولی کپڑوں میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمھارے پاس مال ہے؟ میں نے ہاں ہے۔ آپ نے پوچھا کون سا مال ہے؟ میں نے کہا: اللہ نے مجھے اونٹ گھوڑے اور مال دیئے ہیں اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے تم کو مال دیا ہے تو اللہ کی عنایات اور رحمت و کرامت کا اثر تم پر دکھائی دینا چاہیے۔

□□□□□□□□

مقصد یہ ہے کہ تمھارے جسم پر عمدہ اور صاف لباس ہونا چاہیے جس سے معلوم ہو کہ آپ آسودہ ہیں۔ حضور ﷺ کی اپنی عادت مبارکہ کیا تھی۔ اس ضمن میں سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی میلے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔ آپ کبھی کبھی تیل لگانا پسند کرتے تھے اور سر میں کنگی کیا کرتے تھے۔ سفر میں، آپ ﷺ کنگھی، تیل، مسواک اور آئینہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے جسم لباس، ماحول کی صفائی پر ہمیشہ دھیان رکھتے۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے کہ اللہ تعالیٰ میلے کپڑوں اور پراگندہ بالوں کو ناپسند فرماتا ہے۔ اس کے مقابلے میں رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ اپنے بندے کے ظاہر پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا چاہتے ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمدن کے اعتبار سے آپ ﷺ کا لباس نہایت عمدہ اور نفیس وصاف ستھرا ہوتا۔ آپ ﷺ عموماً سفید لباس زیب تن کرتے روایت میں آتا ہے کہ ایک بار نبی اکرم ﷺ نے ایک ہزار درہم کی چادر اوڑھ کر تشریف لے گئے تھے۔ اس لیے فقہا نے تصریح کی ہے کہ خوبصورت و قیمتی لباس پہننا مستحب ہے کہ یہی رسول

اللہ ﷺ کا اسوہ ہے۔آج ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں، جب بے پناہ سائنسی ترقی کے باعث انسان کے طرز بود و باش، ذرائع نقل و حمل، وسائل، رابطہ و تعاون اور صنعت و حرفت میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ایسے میں محسن انسانیت ﷺ کا اسوہ مبارک ہمیں راہنمائی دیتا ہے کہ اپنے وسائل کے مطابق آپ ان چیزوں کو استعمال میں لا سکتے ہیں۔صفائی، پاکیزگی، آرائش و زیبائش اور سلیقہ مندی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ بات تقویٰ اور خدا ترسی کے خلاف نہیں ہے۔ رکاوٹ و پابندی جس چیز پر ہے وہ غرور اور تکبر ہے۔خود پسندی و خودنمائی ہے۔ ریا کاری و نمود و نمائش ہے اور اللہ کے بندوں کو حقیر جاننا ہے۔ چیتھڑوں میں ملبوس ،فرش پر ڈیرہ ڈالے یا کسی جھونپڑی میں بیٹھا شخص اگر غرور و تکبر میں مبتلا ہے، دل کے اندر دعویٰ خدائی لیے بیٹھا ہے اور اپنی پارسائی و تقویٰ کا زبان حال سے ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے تو اس کے لیے یہ سادگی اور ترک دنیا کچھ سود مند نہیں ہے۔

اس کے مقابلے میں کوئی شخص اعلیٰ قسم کے ملبوسات اور عمدہ قسم کے مکانات میں ہے لیکن اس کا دل و دماغ اپنے اللہ کی نعمتوں کے شکرانے سے معمور ہے تو ایسے انسان کے لیے راحت و آرام کا باعث ہے اگر وہ غرور و تکبر سے کوسوں دور رہے تو وہ بھی یقیناً اللہ کا محبوب بندہ ہو سکتا ہے۔ کہ یہی شیوہ پیغمبری ہے اور یہی میرے آقا کا اسوہ حسنہ ہے۔ فلسفہ دین کے نقطہ نظر سے یہ دنیا اور اس کی زندگی بجائے خود کوئی لعنت نہیں ہے بلکہ اس کے لعنت یا رحمت ہونے کا تعلق انسان کے رویہ سے ہے اگر انسان ان حدود کے اندر زندگی گزارے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہیں تو اس دنیا کی حیات چند روزہ اس کے لیے آخرت کی ابدی بادشاہی کی ضمانت بن جائے گی۔اور اگر وہ ان حدود سے بے پرواہ ہو کر خود اس کو معبود بنا بیٹھے اور اس کی لذتوں میں کھو جائے تو یہ اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔

لاکھوں سلام آپ پر، کروڑوں درود آپ پر
اے رسول محبوب، اے خیر البشر

اللهم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم علیہ

حضرت زاہر بن حرام اشجعیؓ مضافات مدینہ میں رہتے تھے۔ اپنی بستی سے جب کبھی شہر مدینہ آتے تو رسول اللہ ﷺ کے لیے کوئی نہ کوئی دیہی سوغات ضرور لاتے۔ حضور ﷺ کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ ایک دن وہ مدینہ آئے تو سیدھا بازار چلے گئے۔ اتفاق سے رسول اللہ ﷺ کا اس وقت بازار جانا ہوا تو آپ ﷺ نے زاہر کو ایک دوکان پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ حضور ﷺ خاموشی سے اس کے پیچھے جا کھڑے ہوئے اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور پوچھا: کون ہے جو اس غلام کو خریدتا ہے۔ انھوں نے آواز پہچان کر عرض کی، یارسول اللہ ﷺ: اس تجارت میں آپ کو گھاٹا ہوگا (یعنی ایک بدو کو کون خریدے گا)، حضور ﷺ مسکرا دیئے اور فرمایا؛ اللہ کے ہاں تمھاری قیمت بہت زیادہ ہے۔

سیدنا محمد کریم ﷺ کے والد گرامی کا نام عبداللہ تھا، یعنی اللہ کا بندہ، کیا خوبصورت نام ہے! اس سے یہ معلوم ہے کہ اس زمانے کے اہل مکہ اللہ تعالیٰ کے تصور سے آشنا تھے۔ تبھی تو رسول اللہ ﷺ کے دادا نے اپنے بیٹے کا نام عبداللہ رکھا تھا۔ اہل مکہ اللہ کے نام سے کیوں آشنا نہ ہوتے۔ کیونکہ وہ آخر کو سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل کی اولاد سے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ لوگ شرک کی غلاظت میں آلودہ ہو چکے تھے۔ وہ اللہ کریم کو باشاہوں کے بادشاہ اور خداوندوں کے خدا کے طور پر تو تسلیم کرتے تھے لیکن اُس کی ذات وصفات اور اختیارات میں زندہ و مردہ لوگوں اور جاندار و بے جان چیزوں کو اللہ کا شریک ٹھیراتے تھے۔ اُن لوگوں کو شرک کی اس آلودگی سے پاک کرنے کے لیے ہی تو اللہ جل وشانہٗ نے حضور نبی کریم ﷺ کو ان کے اندر مبعوث فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے یکتا و تنہا ہونے کے تصور کو راسخ کرنے کے لیے خوب محنت فرمائی۔ شرک سے اجتناب اور سنت ابراہیمی کی پیروی میں ایک اللہ پر ایمان کی دعوت، یہ ہے حضور ﷺ کی زندگی کا لب لباب۔

ارشاد خداوندی ہے:

قل ھو اللہ احد ،اللہ الصمد ،لم یلد و لم یو لد و لم یکن اللہ کفواً احد،

(القرآن۔سورہ اخلاص)

□□□□□□□□

سیدنا عبداللہ بن عبدالمطلب ایک وجیہ اور خوبصورت نوجوان تھے۔حسن و جمال سے مالا مال اور اخلاق وکردار میں بے مثال تھے۔وہ چھوٹی ہی عمر میں اپنے عزیز واقارب اوراہل وطن کی آنکھوں کا تارابن گئے تھے۔تاریخی روایت ہے کہ ان کے والد عبدالمطلب نے یہ منت مانی تھی کہ اگر اس کے دس بیٹے ہوئے اور وہ ان کی زندگی میں ہی جوان ہو گئے تو ان میں سے ایک بیٹے کو وہ اللہ کی راہ میں قربان کردیں گے۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی خواہش پوری ہوگئی۔اب جب منت کو پورا کرنے کا وقت آیا تو یہ انتخاب کرنا پڑا کہ ان دس جوان جان بیٹوں میں سے کس کو قربان کیا جائے تو اس کے لیے قرعہ اندازی کی گئی۔قرعہ میں عبداللہ کا نام نکلا۔عبدالمطلب ،اپنے جد اعلیٰ کی پیروی میں بیٹے کو ذبح کرنے پر تل گئے۔لیکن برادری اور کنبے قبیلے کے لوگ آڑے آگئے ،لیکن عبدالمطلب کا اصرار قائم رہا۔کوئی راہ نہیں نکل رہی تھی۔آخر ایک کاہنہ کی تجویز پر جناب عبداللہ اور دس اونٹوں کے نام قرعہ ڈالا گیا۔پھر بھی قرعہ عبداللہ کے نام پر پڑا۔اونٹوں کی تعداد بیس کر دی گئی ،قرعہ پھر بھی عبداللہ کے نام نکلا۔دس دس کر کے اونٹوں کی تعداد بڑھاتے گئے ،آخر جب سو اونٹ مقابل لائے گئے اور قرعہ ڈالا تو اس بار قرعہ اونٹوں کے نام نکلا۔اور یوں سیدنا عبداللہ کی جان کے صدقے میں اُن کے باپ کو سو اونٹوں کی قربانی دینی پڑی۔

اس پر سیدنا عبدالمطلب کا لقب ذبیح پڑ گیا۔اس لیے حضور ﷺ فرمایا کرتے کہ میں دو ذبیحوں کی اولاد ہوں یعنی ایک حضرت اسماعیل اور دوسرے جناب عبداللہ۔رسول اللہ ﷺ نے متعدد اوقات میں یہ ارشاد فرمایا کہ میرے نسب میں زنا کا شائبہ تک نہیں ۔یعنی جناب آدم سے لے کر اپنے والدین تک میں جائز نکاح سے ہوں۔بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''میں بنی آدم کی بہتر سے بہتر نسل میں پیدا ہوتا رہا۔یہاں تک کہ اب میں عبداللہ کی

نسل سے پیدا ہوا ہوں''۔سیدنا عبداللہ اور اُن کے آباء کی پاک بازی پر گویا یہ ''الصادق'' کی طرف سے گواہی ہے۔ایک اور روایت میں مخبر صادق ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مجھے ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں میں منتقل کرتا رہا۔درآں حالانکہ میں طیب اور طاہر تھا۔اور جب بھی دو شاخیں ملیں میں بہتر شاخ میں تھا، پھر میں اپنے ماں باپ میں ظاہر ہوا میرا گھر سب گھروں سے افضل، میرا خاندان سب خاندانوں سے افضل اور میرا قبیلہ سب قبیلوں سے افضل ہے۔

(شرح صحیح مسلم۔جلد دوم،ص ۸۷۰)

□□□□□□□□

نکاح انبیاء کی جاری کردہ سنت ہے۔نکاح سے ہی مرد وعورت کے تعلق کو قانونی معاشرتی اور سماجی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔حسب نسب کی پاکیزگی اور اولاد کے قانونی اور جائز تصور ہونے کے لیے قدیم زمانے سے ہی نکاح کا سلسلہ محبوب ومطلوب قرار دیا جاتا رہا ہے۔شریف اور باوقار نوجوانوں نے ہمیشہ اسی طریقے کو پسند کیا ہے۔آج بھی دنیا کی بیشتر اقوام میں نکاح ہی کو قانونی روایت کے طور پر پسند کیا جاتا ہے۔اگرچہ طریقے مختلف ہیں۔نکاح کے مقابلے میں زنا کو یہ عزت حاصل نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ نے عورت ومرد کے اس جائز تعلق کو شرف بخشتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ '' **النکاح من سنتی ،من راغب عن سنتی فلیس منی** '' یعنی نکاح میری سنت ہے جو اس سے اعراض برتے گا اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔عورت اور مرد کے ناجائز تعلق کو ہمیشہ ہر معاشرے نے بری نگاہ سے دیکھا ہے۔انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے دین میں زنا کو بہت بڑا جرم قرار دیا گیا ہے اور بعض صورتوں میں تو اس کے ارتکاب پر قتل تک کی سزا کا نفاذ کیا گیا ہے۔زنا اور اس کے متعلقات کے بارے میں دین اسلام نے واضح ہدایات دی ہیں۔زانی کو معاشرے کا ذلیل ترین فرد قرار دیا جاتا ہے۔انسان کی روحانی ترقی ،اخلاقی نشونما اور تزکیے کی راہ میں زنا سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا جاتا ہے۔اسلام نے عورت ومرد کے جائز وقانونی تعلق یعنی نکاح کے راستے میں حائل رسوم ورواج کی پیچیدگیوں اور بے جا پابندیوں کو ختم کرکے آسانیاں پیدا کی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عبدالمطلب جب جوانی کی عمر کو پہنچے اور شعورِ زندگی سے آشنا ہوئے تو اُن کے والدین کو بھی اُن کی شادی کی فکر ہوئی ۔رشتے دیکھے جانے لگے ،قریش کے اعلیٰ خاندانوں میں حضرت عبداللہ کے شایانِ شان دلہن تلاش کی جانے لگی ۔اچھی طرح چھان پھٹک کے بعد بنوزہرہ میں آنجناب کی نسبت طے کر دی گئی ۔عبداللہ کی منگیتر کا نام سیدہ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف تھا۔ خاندان کے بڑوں میں بات طے ہوگئی اور جانبین میں شادی کی تیاریاں کی جانے لگیں۔شادی کی تاریخ طے ہوگئی ۔اُس زمانے میں رواج کے مطابق دلہا جب نکاح کے لیے جاتا ہے تو تین دن وہیں سسرال میں ہی قیام کرتا اور چوتھے دن دلہن اپنے گھر لے آتا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں نکاح کے لیے جاتے وقت کسی لمبی چوڑی بارات لے جانے کا تصور نہ تھا۔مورخین کا بیان ہے کہ جب شادی کے لیے عبداللہ اپنے والد کے ساتھ جا رہے تھے تو راستے میں مشہور عیسائی عالم ورقہ بن نوفل کی بہن اُمِ قتال کے گھر سے گزرے۔وہ اُس وقت اپنے گھر سے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔بعض روایات میں راستے میں ملنے والی اس خاتون کی بجائے ایک یہودی کاہنہ وعالمہ فاطمہ بنت مرخثعمیہ کا نام آتا ہے۔اُس نے آپ کے چہرے پر ایک خاص قسم کی نورانی چمک دیکھی۔خوبصورت تو وہ پہلے ہی تھے،شادی کے لیے تیاری بھی کی ہوگی یقیناً بہت حسین لگ رہے ہوں گے،اور پھر یہ نورانی چمک سونے پر سہاگہ والی بات تھی،اس لیے کسی خاتون کا ایسے موقع پر دل ہار بیٹھنا کوئی اچھنبے والی بات نہیں۔اور یہی ہوا اُس خاتون نے جناب عبداللہ کو الگ بلایا اور اُسی وقت اپنی ہوس مٹانے کی درخواست کر دی۔ایک باحیا، باوقار پاکباز و پاک طینت نوجوان کے لیے یہ ایک بہت بڑا امتحان تھا ۔اس پر مستزاد یہ کہ اُس خاتون نے یہ پیش کش بھی کر دی کہ اگر میری خواہش پوری کرو گے تو انعام میں وہ سو اونٹ بھی دوں گی جو تیرے باپ نے تجھ پر قربان کئے تھے۔

جناب عبداللہ کو کیا پل صراط پیش آ گئی!!!

راہ جاتے جاتے انھیں کس امتحان سے پالا پڑ گیا!!

تعلم یافتہ اور اعلیٰ نسب کی خاتون، حسن ذاتی سے مالا مال، جوانی کی رعنائیوں سے بھرپور اور چند لمحوں کی بھیک اور اتنے بڑے انعام کا لالچ!!

لیکن اس سب کو ٹھکرانے میں سیدنا عبداللہ کو ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگی۔

انھوں نے جس شان بے نیازی سے اس دعوت گناہ کو ٹھکرایا اور اس موقع پر جو شعر کہے وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

وہ کہتے ہیں:

”حرام کاری کے ارتکاب سے موت بہتر ہے،

اور نکاح کے لیے تحقیق ضروری ہے،

تیرا مطالبہ میں کیوں کر پورا کرسکتا ہوں، جبکہ

صاحب عزت کے لیے اپنی عزت و آبرو اور

اپنے دین کی حفاظت ضروی ہے،

حرام کاری کے ارتکاب سے موت بہتر ہے“۔

سبحان اللہ! کیا حیا ہے۔ اپنی عزت و آبرو اور اپنے دین کا کتنا پاس و لحاظ ہے!!

سیدنا عبداللہ کا یہ جوان قیامت تک کے نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

ایک پیغام آبرو ہے۔

آٹھ سال بعد رب کائنات نے یہ مبارک لمحہ دکھایا تھا کہ آج سرور عالم ﷺ مکہ مکرمہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے تشریف لا رہے تھے۔ وہ مکہ جو آپ کا شہر پیدائش تھا۔ وہ مکہ جو آپ کے آباء کا مسکن تھا۔ وہ مکہ جسے آپ کے جد اعلیٰ نے بسایا تھا اور وہ مکہ جس میں اللہ کا گھر تھا۔ اسی مکہ سے آٹھ سال پہلے آپ کو دین حق کی دعوت دینے کے جرم میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ کسی ملک کو فتح کرنا، فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہونا اور کسی قوم کو مغلوب کر لینا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے اور ہمیشہ فاتح کے لیے غرور نخوت کا باعث ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ نے ان گنت شہر اور ملک فتح ہوتے دیکھے اور ہزاروں لوگوں کو ان میں بطور فاتح داخل ہوتے دیکھا ہے۔ اور ان فاتحین کی شان وشوکت و کروفر غر کا مشاہدہ کیا ہے . اور... آج بھی... یکم جنوری ۶۳۰ء کے دن تاریخ دم سادھے کانپ رہی ہے ممکنت کہ مکہ کے در و بام پر ایک فاتح دستک دے رہا ہے۔ کائنات پر سناٹا طاری ہے کہ نہ معلوم آج اس شہر کے مکینوں پر فاتح اور اس کی فوجوں کے ہاتھوں کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ اس لیے کہ اس شہر کے ان بد بخت مکینوں کے ہاتھوں آنے والے فاتح اور اس کے ساتھیوں پر ڈھایا

جانے والا ظلم وستم تاریخ ابھی بھولی تو نہ تھی۔ یہ تو ابھی کل کی بات معلوم ہوتی تھی کہ جب اہل مکہ نے محسن انسانیت کے قتل کا فیصلہ کیا تھا۔ دارلندوہ کی بھری محفل میں کسی ایک سردار نے بھی آمنہ کے اس دریتیم کی حمایت میں اپنی زبان نہ کھولی تھی۔۔ کوئی ایک ممبر بھی ہادی برحق کی جان بخشی پر راضی نہ تھا، تو آج وہ کس طرح ان سے جاں بخشی اور عفو درگزر کی توقع کر سکتے تھے۔ پھر جب یہ مظلوم حق اپنے ساتھیوں کو لے کر اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ان ظالموں سے دور جا بسا تو یہ ظالم وہاں بھی اپنی فوجیں چڑھا لائے تھے۔ درالہجر ت مدینہ میں ان منتقم مزاج اوباشوں نے انھیں چین نہ لینے دیا۔ وہاں بھی وہ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار حملہ آور ہوئے تھے۔ تو آج وہ کس طرح یہ توقع کر سکتے تھے کہ اُن سے اب انتقام نہیں لیا جائے گا۔ دس رمضان ۸ ہجری کو رسول اللہ ﷺ دس ہزار جانثاروں کا لشکر لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں ایک پڑاؤ مرالظہر ان میں کیا جہاں لشکر قریش کے سردار جناب ابوسفیان ہدایت ربی کے تحت مسلمان ہو گئے۔ پیکر حلم و وفا، سید انسانیت نے اس موقع پر ابوسفیان کی عزت افزائی فرماتے ہوئے اعلان فرمایا کہ اہل مکہ میں سے جو آدمی ابوسفیان کے گھر پناہ لے لے گا اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ اسی طرح جو آدمی حکیم بن خزام کے گھر جا بیٹھے اسے بھی امان حاصل ہو گی۔ اور جو اپنے گھر میں بیٹھ رہے گا اسے بھی کچھ نہیں کہا جائے گا اور جو اللہ کے گھر میں پناہ لے گا اسے بھی امان مل جائے گی۔

آج دریائے عفوو رحمت جوبن پر تھا۔ اتنے بڑے دشمن کو اگر خود معاف کر دیا جاتا تو یہ بھی بہت بڑا اقدام ہوتا کجا کہ اس کی وجہ سے دوسروں کو بھی امان دی جا رہی تھی۔ اتنے بڑے بڑے مخالفین اسلام کو یوں امن و امان کا پروانہ عطا کرنا کسی دنیاوی فاتح کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ خیر البشر ﷺ کا ہی حوصلہ ہو سکتا ہے۔ رحمت عالم ﷺ کے اس اعلان نے جریدہ عالم پر ایک نئی تارخ رقم کی۔ مکۃ المکرّمہ چاروں طرف سے چھوٹے بڑے پہاڑوں میں گھرا ایک شہر ہے ایک بڑی شکل شمال سے جنوب کو جاتی ہوئی اسے قطع کرتی ہے۔ اس بڑی سڑک سے دو چھوٹی سڑکیں آ کر ملتی ہیں۔ ایک حجو ن کی جانب سے، دوسری کدا کی جانب سے، رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں بڑا لشکر شمال کی جانب سے شہر کے اوپر سے وارد ہوا اور ایک لشکر شاہراہ کدا کی جانب سے۔ سیدنا زبیر بن عوام کی قیادت میں آ گے

بڑھا۔تا کہ وادی فاطمہ کی طرف سے ساحل سمندر کی طرف سے کفار کے فرار کو ناممکن بنایا جا سکے۔
لشکر اسلام کا تیسرا حصہ سیدنا خالد بن ولید کی سربراہی میں زیریں مکہ کی جانب سے یعنی جنوب کی طرف سے مکہ کی بڑی شاہراہ میں داخل ہوا۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ اہل مکہ ششدر رہ گئے اور اُن کے حوصلے پست ہو گئے۔اس لیے یہ حملہ آور بغیر کسی قابل ذکر مذاحمت کے مکہ میں داخل ہو گئے۔سیدنا محمد ﷺ کا مکہ میں فاتحانہ داخلہ اس شان عجز وانکساری سے ہوا کہ آج تک تاریخ نے ایسی کوئی دوسری مثال نہ دیکھی ہوگی۔آپ ﷺ اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار تھے۔سر مبارک اپنے اللہ کریم کے حضور جھکا ہوا تھا۔روایات میں آتا ہے کہ فروتنی اور انکساری سے اور اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی کے باعث آپ کا سر مبارک اتنا جھکا ہوا تھا کہ ریش مبارک اونٹنی کے کجاوے کو چھو رہی تھی۔زبان مبارک اپنے کریم آقا کے کلام میں سے سورہ فتح کی تلاوت کرنے میں مصروف تھی۔

ارشاد ہوتا ہے کہ:

> ''اے رسول ہم نے آپ کو کھلی فتح عطا فرمادی تا کہ اللہ تمھاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے،اور تمہیں سیدھے راستے پر قائم رکھے۔اور تم کو زبردست نصرت عطا فرمائے۔وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکنیت عطا فرمائی ہے تا کہ وہ اپنے ایمان میں مزید قائم ہو جائیں زمین وآسمان کے سب لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ علیم وحکیم ہے۔تا کہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوگی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے۔اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے اور اُن منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں۔برائی کے پھیر میں وہ خود آ گئے اللہ کا غضب ان پر ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم مہیا کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔زمین وآسمان کے سب لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست اور حکیم

ہے"۔

(سورۃ توبہ۔ا۔۷)

□□□□□□□□

کیا ہی خوبصورت منظر ہوگا۔اہل ایمان بھی چاروں طرف حضور ﷺ کے گرد پروانوں کی مانند جمع تھے اور اپنے اللہ کریم کی حمد وثنا میں مصروف تھے جس نے آج یہ دن دکھایا تھا اور سب لوگ مکہ کی گلیوں سے گزرتے ہوئے بیت اللہ کی طرف آگے بڑھ رہے تھے۔سیدنا محمد بن مسلمہ نے آپ ﷺ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ رکھی تھی۔سیدنا بلال اور سیدنا عثمان بن طلحہ اونٹنی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور سیدنا اسامہ زید کی تو شان ہی نرالی تھی کہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ اونٹنی پر سوار تھے۔

حرم میں داخل ہو کر سب سے پہلے آپ نے حجر اسود کو بوسا دیا۔

پھر اونٹنی پر بیٹھے ہی بیٹھے کعبہ شریف کا طواف کیا۔

مکہ کی فضا **لبیک اللھم لبیک** کی روح پرور صداؤں سے گونج رہی تھی۔

آپ ﷺ اپنے عصا مبارک کی ٹھوکر سے بیت اللہ کے چاروں طرف رکھے بتوں کو گراتے جاتے تھے اور "**جاء الحق وزحق الباطل، ان لباطل کان زھوکا**" پڑھتے جاتے تھے۔یعنی حق آ گیا اور باطل مٹ گیا باطل ہے ہی مٹنے کے لیے۔اس شان عجز وانکساری سے آپ نے طواف مکمل کیا۔مشرکین مکہ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔بہت سوں نے ابوسفیان اور حکیم بن خزام کے گھر پناہ لے رکھی تھی۔کچھ لوگ انتقام کے خوف سے شہر سے بھاگ گئے تھے۔اور ایک کثیر تعداد حرم کعبہ میں بھی موجود تھی۔بیت اللہ میں موجود مشرکین نے اپنے معبودان باطل کو ہادی حق کے ہاتھوں کرچی کرچی ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

یہ بت تو ہمیشہ سے بے بس تھے ہی آج ان کے ماننے والوں کی بے بسی بھی عیاں ہوگئی تھی۔ان لوگوں کے چہروں پر خوف اور بے بسی کی پیلاہٹ طاری تھی۔جن کے معبود سر عام پٹ رہے ہوں ان اپنا کیا حال ہوگا!

آج وہ شکست خوردہ اور مجرم بنے حیران و ششدر کھڑے تھے۔

آج کا دن اُن لوگوں کا تھا جن کو حرم مکہ سے بے بس کر کے نکال دیا گیا تھا۔

آج کا دن مہاجر صحابہ کا دن تھا اور ان کو پناہ دینے والے انصار کا دن تھا۔

طواف مکمل کر کے رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ کے دروازے پر تشریف لائے۔اس مقدس دروازے پر کھڑے ہو کر دعائے خلیل ﷺ اپنے رب جلیل کا ذکر بلند کرتے ہیں۔سب لوگ دروازے پر اکھٹے ہو جاتے ہیں۔مومن بھی اور مشرک بھی، فاتح بھی اور مفتوح بھی، مسلمان تو ادب سے سر جھکائے ہوئے ہیں اور مشرکین شرمندگی اور ندامت سے۔

حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے سید عالم نے فرمایا:

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں!

وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں،

اُس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، (جب

اُس نے اپنے بندے (رسول) کی مدد و نصرت کی۔

اور اللہ ہی نے تنہا سارے جتھوں کو شکست دی۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

گروہ قریش کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اے قریش کے لوگو: اللہ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کا فخر و غرور مٹا ڈالا ہے، سارے

دہیں اور...............؟؟؟

وہ تو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا، اللہ کریم نے ارشاد فرمایا:

اے لوگو ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا،

پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو،

درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے سب زیادہ عزت والا وہ ہے

جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو‘‘۔

(الحجرات)

□□□□□□□□

قائد انسانیت کے اس خطاب کے دوران میں اہل مکہ اور فاتح فوج کے جوان یوں بت بنے کھڑے تھے جیسے ان کے جسموں سے روح کھینچ لی گئی ہو۔ رسول اللہ ﷺ خطاب کرتے کرتے یکا یک اہل مکہ سے سوال کرتے ہیں کہ:

اے گروہ قریش: تمھارا کیا گمان ہے، میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟

تصور کیجئے کہ پچھلے ۲۰...۲۲ سالوں پر محیط لحہ لحہ کی داستان ظلم و بربریت کسے یاد نہ ہوگی۔ کیا یہ جباران قریش اپنا ڈھایا جانے والا ظلم و ستم بھول چکے ہوں گے؟

وہ زبانیں جو رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں،

وہ جنھوں نے آپ کی راہ میں کانٹے بچھائے تھے،

وہ جو آپ کے قتل کی سازش میں شریک تھے،

کیا یہ سب مناظر اُن کو یاد نہ ہوں گے؟

کیا بیت اللہ کے درو دیوار ان لحات کو بھول چکے ہوں گے کہ جب اہل ایمان پر حرم کے اندر ستم ڈھایا جاتا تھا۔

کیا صحابہ کرام اپنے جسموں پر لگائے جانے والے زخموں کو بھول چکے ہوں گے؟

کیا خود ظالم اپنے جور جفا کے سب طریقے یاد نہ کرتے ہوں گے؟

کرتے ہوں گے، یقیناً ان کو ایک ایک چیز یاد ہوگی۔

ابھی تو سب زخم ہرے تھے، ابھی تو سب چرکے تازہ تھے،

سیدنا بلال، سیدنا خبیب، سیدنا عمار بن یاسر پر ڈھایا جانے والا ظلم و تشدد؟

کیا یہ بھی کوئی بھولنے والی چیز تھی؟

اپنے پیارے چچا سیدنا حمزہ کا مثلہ کیا گیا لاشا خود رسول اللہ ﷺ کو کب بھولا تھا؟

. کیا ابھی اس سارے ظلم وستم کا انتقام لیا جائے گا؟؟

لے کا موقع ہے؟ ہونا تو یہی چاہیے تھا، فاتحین کی روایت تو یہی تھی۔

لیکن....... یہ کوئی عام فاتح تو نہ تھا جو انتقام کے لیے اندھا ہو جاتا۔ یہ کوئی عام لشکر تو نہیں ہے یہ تو

لا کے سپاہی ہیں سپہ سا اللہ کا آخری ر

تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر آنے والا رسول!!

اور اللہ .... ل ۔

یہ تو اللہ کا پیغمبر ﷺ خطاب کر رہا تھا، عفو در گزر کا پیام بر بول رہا تھا ہے

آج محض ایک فاتح اور بادشاہ نہیں بول رہا تھا بلکہ رحمت عالم تقریر کر رہے تھے۔

اس لیے زمانہ بجا طور پر شفقت ورافت کا منتظر تھا۔

جو دل ہی دل میں مان چکے تھے، جواب جان چکے تھے اور وہ جواب رحمت ورافت کو پہچان چکے تھے

یک زبان ہو کر بول اٹھے، کہنے لگے!

اے اللہ کے رسول: ہمیں آپ سے خیر کی توقع ہے، کیونکہ آپ برادر کریم ہیں، آپ رسول امین ہیں

اور کریم بھائی کی اولاد ہیں۔

سراپا عفو درگزر اور رحمت عالم نے فرمایا:

جاؤ آج تم آزاد ہو۔ اس موقع پر میں بھی وہی کچھ کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے

اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ اللہ تمہیں معاف فرمائے اور وہ

بہت رحم کرنے والا ہے۔

اب پیارے رسول کا اسوہ کیا بنا؟ غور کیجیے حضور کی سنت کیا ٹھہری؟؟

عفو درگزر!! دشمن پر قابو پانے کے بعد دلوں کو فتح کرنے کا نام ہے۔

انتقام میں اندھا ہونا نہیں!!

□□□□□□□□

سلام آپ پر، اے رحمت لقب پانے والے،

میرے آقا، میرے محبوب،

درود آپ پر، اپنی جان کے دشمن کو بھی سینے سے لگانے والے،

اے پیارے رسول ﷺ

اللھم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم علیه

حضور ﷺ کو حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اور ان کے گھر والوں سے خصوصی لگاؤ تھا۔ آپ ﷺ کبھی کبھی ابوطلحہؓ کے گھر تشریف لے جاتے اور وہاں استراحت فرمایا کرتے۔ سیدنا انسؓ جو آپ ﷺ کے خاص خادم تھے کا یہی گھر تھا۔ان کی والدہ سیدہ اُم سلیمؓ تھیں۔جنھوں نے حضرت انسؓ کے والد کی وفات کے بعد، سیدنا ابوطلحہؓ سے شادی کی تھی۔ابوطلحہؓ کے ایک کم سن صاحب زادے تھے،ان کا نام ابوعمیر تھا۔ابوعمیر نے ایک چھوٹا سا خوش نما خوش آواز پرندہ پال رکھا تھا، جس کو نغیر کہتے ہیں۔اتفاق سے وہ مر گیا تو ننھے ابوعمیر کو بہت صدمہ ہوا۔اسی اثنا میں حضور ﷺ اُن کے گھر تشریف لے آئے۔ابوعمیر کو بجھا بجھا اور نہایت ست دیکھا تو اس کی والدہ اُم سلیم سے پوچھا؟ کیا بات ہے آج ابوعمیر کچھ ست ہے۔انھوں نے عرض کی؛ یارسول اللہ ﷺ ابوعمیر کی چڑیا (نغیر) مر گئی ہے۔اس کا صدمہ ہے بچے کے ذہن پر۔اُس سے یہ کھیلا کرتا تھا۔حضور ﷺ نے ابوعمیر کو اپنے پاس بلایا، محبت سے پیش آئے، کافی پیار کیا پھر پوچھا: "**یا ابا عمیر مافعل النغیر**" (اے ابوعمیر تیری چڑیا نے کیا کیا) آپ ﷺ نے عمیر اور نغیر کا کچھ اس طرح سے قافیہ ملایا کہ ابوعمیر کھل کھلا کے ہنس پڑا اور اس کی پژمردگی دور ہوگئی۔

اُم المومنین سیدہ عائشہؓ کا بیان ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ غزوہ حنین سے واپس گھر تشریف لائے یا غزوہ تبوک سے اب صحیح طرح سے یاد نہیں رہا، گھر کے بڑے طاق پر پردہ پڑا دیکھا، جس کا ایک کونا ہوا سے کھل گیا تھا جس سے طاق کے اندر رکھی چیزیں ظاہر ہوگئیں تھیں۔ان میں بچیوں کے کھیلنے کی چیزیں بھی تھیں۔رسول اللہ ﷺ نے پوچھا عائشہ یہ کیا ہے۔انھوں نے کہا: یہ میری گڑیاں ہیں۔ان گڑیوں کے ساتھ ہی ایک گھوڑا بھی رکھا تھا لکڑی کا ہوگا یا مٹی کا اس کے دو پر بھی تھے۔ یہ پر کاغذ کے بنے تھے یا کپڑے کے۔آپ ﷺ نے پوچھا: عائشہ یہ گڑیوں کے درمیان کیا چیز رکھی ہے۔سیدہ عائشہ نے عرض کی، یہ گھوڑا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا تو یہ پر کیسے ہیں۔ سیدہ عائشہ نے کہا: آپ نے سنا نہیں کہ حضرت سلیمان کے گھوڑے کے پر بھی تھے۔سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ میری یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ کھل کھلا کر ہنسے کہ آپ کے اندرونی دانت مبارک (نواجذ) نظر آنے لگے۔

(مشکوٰۃ، باب عورتوں کے حقوق، بحوالہ ابوداؤد)

اللہ کے رسول ﷺ اپنے گھر میں کس طرح رہتے تھے اس کا نقشہ اس حدیث مبارک سے ظاہر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ سے شادی کے وقت حضرت عائشہ کی عمر مبارک بہت کم تھی، آپ نے سیدہ کی اس چھوٹی عمر کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور ان دلچسپیوں کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں اپنا حصہ بھی ڈالا۔ گھوڑے کے پروں کے بارے میں سیدہ عائشہ کا جواب جو معصومیت لیے تھا آپ نے اس کو خوب enjoy کیا اور خوب کھل کھلا کر ہنسے۔ ان لوگوں کے لیے اس کے اندر سبق ہے جو اپنی بیویوں کے ساتھ ہنسی مذاق کو خلاف تقویٰ جانتے ہیں اور گھر کے اندر بیوی بچیوں پر کرفیو نافذ کیے رکھتے ہیں۔ ان حضرات سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اللہ کے رسول کا اسوہ ملاحظہ کریں اور اس کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل مرتب کریں اور اپنی اصلاح کی کوشش کریں۔ آپ ﷺ سے زیادہ متقی کون ہوسکتا ہے۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ:

ایک بار حضور ﷺ نے اور میں نے آپس میں دوڑ لگائی۔ میں جیت گئی۔ کچھ عرصہ بعد مجھ پر گوشت اور چربی چڑھ آئی جس کے باعث میرا جسم بھاری ہو گیا۔ اب رسول اللہ ﷺ سے دوبارہ مقابلہ ہوا تو میں ہار گئی اور رسول اللہ ﷺ جیت گئے۔ سرور عالم ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: یہ اُس روز کا بدلہ ہے۔

(سنن ابوداؤد)

❑❑❑❑❑❑❑❑

گھر میں اپنی ازواج کے ساتھ رسول اللہ ﷺ جس بے تکلف اور محبت بھرے ماحول میں رہتے تھے اس کی ایک جھلک اس روایت سے بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ اس وقت آپ کی عمر کا بھی اندازہ کریں اور رسالت کی ذمہ داریوں کا بھی اور ریاست کی سربراہی کی مشکلات کو بھی پیش نظر رکھیں تو پھر آپ کو حضور ﷺ کی اس طرز زندگی کی قدر و قیمت کا احساس ہو سکے گا۔ بیویوں کے ساتھ اس حد تک بے

تکلفی!

کیالائق تقلیداسوہ ہے!!

سبحان اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ عمدہ سلوک کرنے والا ہو، اور تم میں سے سب سے زیادہ اپنے اہل کے ساتھ عمدہ سلوک کرنے والا ہو۔

(ترمذی)

□□□□□□□□

یہ سنت ہے۔ عورت کو کیا اعزاز واکرام سے ہے، سیدی خیر البشر نبی نے!!

صلی اللہ علیہ وسلم۔ لاکھوں درود پر آپ پر اور آپ کی آل اولاد پر!!

اُم المومنین سیدہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ:

ایک دفعہ میں نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ میرے گھر کے دروازے پر کھڑے ہیں اور حبشی لوگ مسجد میں اپنے نیزوں سے کھیل رہے تھے (میں نے کھیل دیکھنا چاہا تو) حضور ﷺ نے اپنی چادر کی اوٹ بنالی تاکہ میں بھی ان کا کھیل دیکھ سکوں، چنانچہ میں آپ کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور آپ ﷺ کے کان اور مونڈھے کے درمیان سے کھیل کو دیکھنے لگی اور آپ ﷺ اس وقت تک میری خاطر کھڑے رہے جب تک کہ میں کھڑی رہی۔ اس سے تم اندازہ کرلو کہ ایک نوجوان لڑکی جو کھیل تماشے کی شائق ہو کتنی دیر کھڑی رہ سکتی ہے۔

(مشکوٰۃ مترجم، دوم ۱۲۰، بحوالہ بخاری ومسلم)

□□□□□□□□

بیوی کی کیسی دلداری ہے!!

اور کس طرح لاڈ کیا جارہا ہے۔

میں صدقے واری جاؤں اپنے سوہنے نبی کے اس اسوہ حسنہ پر!!

ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

اُم المومنین سیدہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ:

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا میں جانتا ہوں کب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور کب ناراض میں نے عرض کی آپ کیوں کر پہچان لیتے ہیں۔ فرمایا جب تم مجھ سے خوش اور راضی ہوتی ہو تو اس طرح کہتی ہو، "یہ بات نہیں ہے محمد کے رب کی قسم" اور جب تم ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو، یہ بات اس طرح نہیں ہے ابراہیم کے رب کی قسم! حضرت عائشہ کہتی ہیں میں نے عرض کیا؛ ہاں رسول اللہ ﷺ آپ کی یہ بات ٹھیک ہے۔ میں ایسے میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔(وگرنہ دل میں تو آپ کی محبت وہی رہتی ہے)۔

دیکھا آپ نے، کہ گھر میں میاں بیوی کے چھوٹی موٹی ناراضگیاں ہو ہی جاتی ہیں اور حضور ﷺ کے خانہ اقدس میں بھی ایسا ہو جاتا تھا۔

کیا ہی خوبصورت دولت کدہ تھا! محبت و پیار سے لبریز۔

ایک دوسرے سے محبت والفت سے بھرا خزانہ!!

❑❑❑❑❑❑❑❑

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ:

نبی اکرم ﷺ کے پڑوس میں ایک فارسی رہتا تھا۔ وہ شوربہ بہت اچھا بناتا تھا۔ اس نے شوربہ بنایا پھر رسول اللہ ﷺ کو اس کی دعوت دی۔ آپ نے سیدہ عائشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: کیا اس کی بھی دعوت ہے۔ اس نے کہا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا پھر میں بھی نہیں آتا۔ وہ لوٹ گیا اور پھر آیا اور عرض کی؛ آپ ﷺ نے دوبارہ پوچھا کہ عائشہ کی بھی دعوت ہے؟ اس نے کہا: نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: پھر میں بھی نہیں آتا۔ وہ لوٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد پھر حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے پھر وہی

سوال دہرایا تو اس نے کہا: ہاں ان کی بھی دعوت ہے۔ پھر آپ دونوں اٹھ کر اس کے گھر تشریف لے گئے۔

(مسلم، کتاب الاشربہ)

□□□□□□□□

سیدہ خدیجہ طاہرہ کی یادیں:

سیدہ خدیجہ طاہرہ آپ کی پہلی بیوی ہیں۔ جب تک وہ زندہ رہیں، حضور اکرم ﷺ نے دوسرا نکاح نہیں کیا۔ آپ سے حضور ﷺ کی رفاقت کم وبیش ۲۵ سالوں پر محیط ہے۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ اکثر خدیجۃ الکبری کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ اتنی زیادہ تعریف فرمایا کرتے تھے۔ اتنی زیادہ تعریف فرماتے کہ ہمیں قریش کی اس بڑھیا پر حسد (بمعنی رشک) آنا شروع ہو جاتا۔ جب کبھی ہمارے ہاں بکری ذبح ہوتی تو اس کی بوٹیاں بنوا کر سیدہ خدیجہ کی سہیلیوں کی طرف بھیجا کرتے ایک بار رسول اللہ ﷺ نے سیدہ خدیجہ کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائی جب اوروں نے میرا انکار کیا،

اُس نے میری تصدیق کی جب اور لوگوں نے مجھے جھٹلایا،

اُس نے مجھے اپنی دولت میں اس وقت شریک کیا جب سب دروازے مجھ پر بند تھے،

اُس کے بطن سے اللہ نے مجھے اولاد دی۔

گویا بیوی کی خوبیاں بیان کرنا، اس کا ذکر خیر کرنا اور اس کے احسانات کو یاد رکھنا اسوہ پیغمبر ہے!!

سیدہ خدیجہ سے حضور ﷺ کو بے پناہ محبت تھی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے سیدہ عائشہ ایک بڑا خوبصورت واقع بیان کرتی ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ، ایک بڑھیا خاتون جس کا نام حسانہ مزنیہ تھا، رسول اللہ ﷺ سے ملنے آئی۔ نبی اکرم ﷺ نے نہایت محبت وشفقت سے اس کا استقبال کیا، اُس سے پیار بھری باتیں کرتے رہے، اُس سے پوچھتے رہے کہ ہمارے بعد تمھارا کیا حال رہا۔ اس طرح اس سے ماضی کے قصے چھیڑے رکھے۔ جب وہ چلی گئی تو میں نے پوچھا یہ بڑھیا کون تھی جس سے آپ

یوں عنایت سے گفتگو کر رہے تھے۔حضور نے ارشاد فرمایا، یہ خدیجہ کی سہیلی تھی ۔اسے خدیجہ سے بہت محبت تھی۔

مرحومہ بیوی کی سہیلی سے یوں محبت وعنایت، دراصل بیوی کو خراج محبت ادا کرنا ہے،۔سیدہ خدیجہ کے وفات کے بعد حضور جس طرح ان کی یادوں میں رہتے تھے، زندگی میں جو لطف کرم رہا ہوگا خوب اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔حضرت خدیجہ علیہ السلام آپ ﷺ کی نبوت کے ابتدائی حالات میں آپ کی ہمدم ودمساز رہ چکی تھیں۔اس لیے اُن کی خدمات اوران کی وفا شعاری کو آپ کبھی فراموش نہ کرتے تھے۔اور آپ اُن سے اپنی گہری محبت اور تعلق خاطر کا اظہار ہمیشہ کیا کرتے۔روایت ہے کہ غزوہ بدر میں حضور ﷺ کے بڑے داماد سیدنا ابوالعاص اہل مکہ کی طرف سے لڑنے آئے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

مشرکین کے قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ کا طریقہ طے ہوا۔ابولعاص کی بیوی سیدہ زینب نے اپنے خاوند کی رہائی کے لیے حضور ﷺ کے پاس وہ ہار بھیجا جو اُن کی امی جان زوجہ رسول سیدہ خدیجہ طاہرہ نے شادی کے موقع پر اُن کو تحفہ دیا تھا۔اپنی مرحومہ بیوی کی اس نشانی کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ پر رقت طاری ہوگئی اور سیدہ کی یاد میں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا اگر تم اجازت دو تو زینب کو یہ ہار واپس کر دیا جائے اور اس کے خاوند کو رہا کر دیا جائے۔جانثار صحابہ کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

اُم المومنین سیدہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ:

ایک بار رسول اللہ ﷺ گھر میں تشریف فرما تھے اور اپنے جوتوں کی مرمت کر رہے تھے، ہاں، ہاں سید عالم خود اپنے جوتوں کی مرمت کر رہے تھے۔اور سیدہ عائشہ قریب بیٹھی چرخہ کات رہی تھیں، زوجہ رسول کا بیان ہے کہ میں وقفے وقفے سے آپ کو کام کرتا دیکھ لیتی تھی۔آپ کے چہرہ انور پر پسینہ آیا ہوا تھا۔اور پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ان قطروں سے نور ٹپکا پڑتا تھا اور میں

سراپا حیرت بنے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔اس دوران میں حضور انور نے میری طرف نظر مبارک اٹھائی اور پوچھا؟ عائشہ اتنی حیرت زدہ کیوں ہو اور کیا دیکھے جا رہی ہو؟ سیدہ عائشہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ: آپ کی پیشانی پر پسینے کے جو قطرے آئے ان میں چمکتا دمکتا نور ہے اس منفرد نظارے سے میں حیرت زدہ ہوں۔خدائے لم یزل کی قسم ! اگر ایام جاہلیت کا مشہور شاعر ابو کبیر ہذلی حضور کی زیادرت سے شرف یاب ہوتا اُسے معلوم ہو جاتا کہ اُس کے ان اشعار کا مصداق کون ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے پوچھا اس کے اشعار کون سے ہیں۔

سیدہ عائشہ کہتی ہیں جب میں نے ابو کبیر ہذلی کے یہ شعر سنائے:

و مبری ء من کل غیر حیفة و فساد مرضعة و داء معضل

وا اذا انظرت اِلیٰ اسرة و جھہٖ برقت کبرق العارض المتھلل

وہ ولادت ورضاعت کی آلودگیوں سے مبرا ہیں،

ان کے درخشاں چہرے پر نظر کرو تو معلوم ہوگا کہ نورانی اور روشن برق اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔

یہ اشعار سنتے ہی سید انسانیت کے ہاتھ میں جو کچھ تھا،اسے رکھ دیا اور سیدہ کے پاس آ کر ان کی پیشانی پر پیار کیا اور ارشاد فرمایا؛

جو سرور ولذت مجھے تمھارے کلام سے حاصل ہوئی ہے اس قدر لذت تجھے میرے نظارے سے حاصل نہیں ہوئی ہوگی۔

(رحمت للعالمین ،جلد دوم ۔۔ص ۱۵۱)

□□□□□□□□

واہ سبحان اللہ کیا عمدہ داد ہے! کس قدر بے تکلف ماحول ہے

اور کیسا شاندار نمونہ ہے ہمارے لیے جس کی اتباع کر کے ہم اپنے گھروں کے سکون کو بحال رکھ سکتے

ہیں اور آخرت میں بھی اس اسوہ مبارک کی پیروی کر کے یقینی کامیابی وسرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

اللھم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم علیہ

اس دنیا میں انسان دوسرے انسانوں کا محتاج ہے۔اپنی ضروریات کی فراہمی اور اپنے مسائل کے حل کے لیے ہر آدمی دیگر آدمیوں پر انحصار کرتا ہے۔اس وجہ سے انسانوں کے درمیان پیشے اور کاموں کی کئی نوعتیں وجود میں آئیں۔لوگوں کے حقوق وفرائض کا تعین ہوا کاروباری تعلقات قائم ہوئے۔ کارحیات کی انجام دہی میں اگر مختلف قسم کی حدود وقیود کا تعین نہ ہو اور رابطہ کار تجویز نہ ہوں اور ان پر دیانتدارانہ عمل درآمد نہ ہو تو ہماری یہ باہمی زندگی انتشار کا شکار ہو جائے۔اپنے اپنے پیشوں اور اپنے اپنے شعبوں میں دیانتداری برتنا ہمارے دین کی اعلیٰ تعلیمات میں سے ہے۔سطور ذیل میں اس پہلو سے ہم رسول اللہ ﷺ کی مقدس زندگی سے چند موتی منتخب کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔مذہبی شخصیات میں عموماً چند رسومات پرستش کی پاسداری میں مبالغے سے کام لیا جاتا ہے ۔لیکن جنھیں ''دنیاوی معاملات'' کہا جاتا ہے ان میں کسی قسم کی اخلاقی ضابطوں کی پابندی روا نہیں رکھی جاتی۔ یہ رویہ میرے آقا حضور محمد ﷺ کے مبارک اسوہ کے خلاف ہے۔آیئے ملاحظہ کرتے ہیں کہ سیدی محمد کریم ﷺ اعلان نبوت سے قبل ہی اپنے معاشرے میں ''الامین والصادق'' کے القابات سے معروف ہو چکے تھے۔

"یعنی سب سے زیادہ امانتدار اور سب سے زیادہ سچے"۔

یہ القابات کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، کاروباری ساکھ جمانے میں مدتیں لگتی ہیں اور خونِ جگر سینچنا پڑتا ہے، ہزاروں قسم کی ترغیبات کو ٹھکرانا پڑتا ہے اور کئی قسم کے مفادات کو تج دینا ہوتا ہے، تب کہیں جا کر معاشرہ ایسے القابات عطا کرتا ہے۔ پیارے رسول ﷺ کی قبل از نبوت کی چالیس سالہ زندگی ایک ایسی روشن اور تابناک زندگی ہے کہ ہم چاہیں تو اس سے اپنی تاریک تر زندگی کو روشن و منور کر سکتے ہیں جوانی کے آغاز سے ہی حضور اکرم ﷺ نے تجارت شروع کر دی تھی۔ اس کاروبار کو آپ نے کچھ اس طرح سے چلایا کہ معاشرے میں آپ صادق اور امین تاجر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں بے ایمانی اور بد دیانتی کا دور دورہ ہو، جہاں ایک دوسرے کو دھوکا دینے اور کذب بیانی سے مال بیچنے کو عقلمندی اور چالاکی سمجھا جاتا ہو، وہاں پر اپنی امانت اور صداقت کا راج قائم کرنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔ محمد ابن عبداللہ (ﷺ) اس معاشرے کا ایک فعال حصہ تھے لیکن انھوں نے اپنے دامن کو ہر طرح کی کاروباری الائشوں سے محفوظ رکھا، تبھی تو الصادق والامین کہلائے۔ اگر محمد بن عبداللہ (ﷺ) ایک تارک الدنیا اور خلوت نشیں درویش ہوتے اور ان دنیاوی آلائشوں سے محفوظ رہتے تو کوئی اچھنبے کی بات نہ تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بھرپور کاروباری اور سماجی زندگی گزاری۔

آپ ﷺ اپنے معاشرے کے فعال ترین آدمی تھے، دنیا کے ہر کام میں آپ نے حصہ لیا اور اپنے اخلاق و کردار اور پیشہ ورانہ دیانت کا وہ اعلیٰ ترین معیار قائم کیا کہ سماج کو ماننا پڑا کہ آپ ہی سب سے زیادہ سچے اور سب سے زیادہ ایماندار ہیں۔ کاروباری دیانت کی یہ شہرت ہی تھی جس کی بنا پر سیدہ خدیجہ طاہرہ نے آپ کو اپنے بزنس کا مینیجر اور کاروبار کا ساجی بنانے کی پیشکش کی۔ سیدہ خدیجہ طاہرہ کوئی معمولی تاجرہ نہ تھیں وہ مکہ کی ایک انتہائی متمول اور ماہر کاروباری خاتون تھیں۔ سیدہ طاہرہ کا مال و اسبابِ تجارت کی غرض سے بیرون ملک کی منڈیوں میں جایا کرتا تھا۔ یہ وسیع کاروبار ظاہر ہے وہ ملازمین کے ذریعے ہی چلاتی تھیں۔ یا مختلف تاجروں کے ساتھ شراکت پر سرمایا فراہم کرتی تھیں۔ محمد بن عبداللہ (ﷺ) کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ اس کام کی آپ ﷺ کے اندر مہارت اور

صلاحیت موجود تھی۔ساتھ ہی آپ ﷺ کی صداقت و دیانت کی شہرت بھی تھی جس کے باعث سرمایہ کاروں میں حضور ﷺ کی مانگ بڑھ گئی تھی ۔آپ ﷺ کی معاملہ فہمی ،کاروباری فہم وفراست اور امانتدارانہ طرزِعمل کے باعث ہر آدمی خواہش تھی حضور ﷺ اس کے ساتھ کاروباری تعلق پیدا کریں، اور یہی خواہش سیدہ خدیجہ طاہرہ کی بھی تھی ۔حضور ﷺ کے پاس ذاتی سرمایہ نہ تھا۔اس لیے مضاربت کے اصول پر دوسروں کے سرمایہ کے ساتھ اپنی محنت وصلاحیت اور دیانت وامانت کو شامل کر کے جو منافع کماتے اس میں اپنا حصہ پاتے ۔اسی شہرت کے باعث سیدہ خدیجہ طاہرہ نے آپ سے درخواست کی کہ آپ میرے کاروبار کو سنبھالیں بیرون ملک جانے والے تجارتی قافلے میں میرا سامان لے جائیں ۔آپ ﷺ نے اپنے چچا کے مشورے سے مکہ کی اس سب سے بڑی تاجرہ کی پیش کش قبول کر لی شرائط طے ہو گئیں،قافلہ روانہ ہو گیا۔جب واپس آیا تو سیدہ طاہرہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ اس سال پچھلے سالوں کی نسبت کہیں زیادہ منافع ہوا تھا۔ایسا صرف اور صرف حضور ﷺ کی تجارتی معاملہ فہمی ،پیشہ ورانہ دیانت اور انتھک محنت کے باعث ہوا۔قافلے کے ساتھ جانے والے سیدہ طاہرہ کے ملازمین خصوصاً میسرہ نے واپسی پر حضور ﷺ کے طرزِعمل کے بارے میں جو رپورٹ دی وہ حیران کن حقائق پر مبنی تھی ۔جس طرح آپ گاہکوں سے سودا طے کرتے ،جس محنت سے بازار میں اپنی اشیا سجاتے اور جس دیانتدارانہ طریقے سے سرمایہ کو سنبھال سنبھال کر رکھتے اس پر میسرہ خوش کن حیرت میں مبتلا تھا اور اس نے اپنی مالکن کو مشورہ دیا کہ اس منتظم سے مستقل معاہدہ کر لیں۔حضور ﷺ کی صداقت اور پیشہ ورانہ دیانتداری کا نتیجہ ہی تھا کہ سیدہ طاہرہ نے آپ کو کاروباری شریک کے بجائے شریک حیات بنانا پسند کیا۔

اللہ کے لاکھوں انعام سیدہ خدیجہ طاہرہ پر!!

اپنوں کے ساتھ اور دوست احباب کے ساتھ،امانت و دیانت کا رویہ تو ہر کوئی اپنا لیتا ہو گا لیکن سیدی محمد کریم ﷺ کا اسوہ مبارک ملاحظہ کیجئے کہ آپ ﷺ اپنی جان تک کے دشمنوں کے ساتھ بھی امانت و دیانت کا رویہ رکھتے تھے۔اور اسی چیز کی تعلیم اپنے ماننے والوں کو دیتے تھے۔قریش کی پارلیمنٹ (دالندوہ) میں اپنی نوعیت کا انتہائی اہم فیصلہ ہو چکا ہے۔سیدنا محمد بن عبداللہ ﷺ کے قتل کے لیے

قاتل دستہ منتخب کرلیا گیا ہے۔ تیرہ سالہ جدوجہد نبوت میں یہ مشکل ترین لمحہ تھا۔اب جب کہ منکرین رسالت اپنے آخری فیصلے پر پہنچ چکے تھے اور انتہائی اقدام اٹھانے کا منصوبہ بنالیا گیا تھا تو پھر یہ طے کرنا اب مشکل نہیں رہا کہ حق کی قبولیت کا اس معاشرے میں کوئی امکان نہیں تھا، جب کسی رسول کا مخاطب معاشرہ اس سطح پر پہنچ جائے تو اللہ کریم نے اپنے رسول کو وہاں ہجرت کر جانے کا حکم دیتے ہیں۔ سیدنا محمد ﷺ کو بھی ہجرت کا حکم مل چکا ہے آپ ﷺ ان نازک ترین حالات میں ہجرت کی تیاریاں کرر ہے ہیں۔اس لمحے، آپ ﷺ کو سب سے زیادہ جس چیز کی فکر ہے،

اسو چیئے . ہو ‍ ہے ؟.

پنی جان کی ! . نہیں،نہیں۔

کیا توسفر کے زادراہ کے لیے . نہیں!

یہ بھی کوئی فکر کی بات نہیں کہ اس کا ذمہ جگری دوست جناب ابوبکر نے لے لیا ہے،

تو پھر کیا پریشانی ہے؟

بیو بچوں کی فکر.... . نہیں

یسی بھی کوئی بات نہیں

کیونکہ موجودہ حالات میں ان کے لیے خطرے کا کوئی پہلو نہیں۔

اس لیے کہ دشمن صرف آپ کی جان کا دشمن ہے۔

پھر کس چیز کی فکرمندی ہے؟

آپ ﷺ کو گھر میں رکھی دشمن کی امانتوں کی فکر ہے۔

اہل مکہ، باوجود یہ کہ آپ ﷺ کے دین کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر چکے تھے اور اب بھی اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے حتیٰ کہ آپ کی جان کے درپے ہو گئے ہیں لیکن وہ آپ کی ذات میں کسی قسم کا اخلاقی عیب تلاش نہ کر سکے تھے۔ وہ آپ پر اس حد تک اعتماد کرتے تھے کہ اپنی قیمتی چیزیں، نقدی اور زیور وغیرہ آپ ﷺ کے پاس بطور امانت رکھوا دیتے تھے۔ اس لیے کہ وہ آپ ﷺ کو سب سے زیادہ مانتدار سمجھتے تھے۔ اور الامین کا لقب دیتے تھے۔ انھیں محمد بن عبداللہ

(ﷺ) سے کسی قسم کی بے ایمانی، کذب بیانی اور بددیانتی کے صدور کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔گھر دشمن کی امانتوں سے بھرا تھا اور آپ ﷺ کو یہ گھر یہ شہر چھوڑنے کا حکم مل چکا تھا۔ان امانتوں کا کیا کریں اگر تو لوگوں کو واپس پہنچاتے ہیں تو راز ہجرت کھل جاتا ہے اور اگر ان کو لوٹاتے نہیں تو صدق و دیانت پر داغ لگتا ہے۔

آج کل آپ اس پریشانی میں ہیں۔لوگوں کی امانتوں کے بارے میں فکرمندی ہے۔

آخر اس کا یہ حل نکالا کہ اپنے محبوب ترین بھائی کو یہ مشکل ترین ڈیوٹی دی کہ میری یہ امانتیں سنبھالو ،میرے بعد ایک ایک کو اس کی امانت لوٹا کر مدینہ آؤ۔ہجرت کی رات یہ ڈیوٹی سیدنا حضرت علی ابن ابی طالب کے ذمہ لگی۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ دوزخ کی آگ ہر ایسے شخص پر حرام ہے جو تیز مزاج نہ ہو، نرم ہو اور لوگوں سے قریب ہونے والا یعنی ملنسار اور نرم خو ہو"۔

(ترمذی، ابوداؤد)

حبشہ کا بادشاہ نجاشی مسلمانوں کا بہت خیر خواہ اور خدمت گزار تھا۔ اس نے ایک وفد حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ نے اس وفد کو اپنا مہمان بنایا اور خود بنفس نفیس ارکان وفد کی خدمت کی اور مہمانداری فرماتے رہے۔ یہ دیکھ کر صحابہ نے عرض کی؛ یارسول اللہ ﷺ، آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں ہم ان کی خدمت کے لیے موجود ہیں۔

رسول رحمت ﷺ نے فرمایا؛ نہیں، ان لوگوں نے میرے ساتھیوں کی مہمانداری کی تھی جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے اس لیے آج ان کیخدمت میں خود کروں گا۔

جاڑے کے دن ہیں، فروری کی سخت سردی ہے۔ کہر اور دھند سے ہر کوئی ٹھٹھرا پڑا ہے۔ اس عالم میں لشکر اسلام رسول اللہ ﷺ کے غلام کھلے میدان میں ایک سخت مشقت میں مصروف جہد ہیں۔ کہ جس کی مثال اور جس کا تجربہ انھیں قبل ازیں نہ ہوا تھا۔ مدینہ کے باہر سے آنے والی خبریں انتہائی حوصلہ شکن تھیں۔ دین و مذہب کے دشمن مدینۃ اسلام پر اپنے آخری حملے کے لیے اپنی تمام تر قوتیں سمیٹنے کی کوشش میں تھا۔ اور صحابہ کرام مکمل یکسوئی، کامل یکجہتی اور بے مثال جذبہ جہاد سے سرشار اپنے قائد کریم ﷺ کی معیت میں، مدینہ طیبہ کے گرداگرد حفاظتی خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ یہ شوال ۵ ہجری کا زمانہ تھا۔ کفر اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت چاروں طرف سے اسلام کی ننھی منی ریاست کو ملیامیٹ کرنے کے لیے دوڑا چلا آرہا تھا۔ ایسے میں اہل ایمان نے باہمی مشورے سے یہ

طے کیا تھا کہ مدینہ کے ارد گرد ایک گہری خندق کھود لی جائے اور اب وہ اس دفاعی حصار کے قائم کرنے میں مصروف تھے۔ صحابہ کرام کے ہاتھوں عرب کی تاریخ کا ایک عجوبہ جنم لے رہا تھا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ سیدنا سلیمان فارسی کے مشورہ پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ مدینہ طیبہ کے ایک طرف جدھر سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہوسکتا تھا ایک گہری اور چوڑی خندق کھود لی جائے جو حفاظتی حصار کا کام دے حضورﷺ نے اس کے لیے خود ماہرانہ سروے فرمایا اور کھدائی کی جگہ کی گہرائی اور طول عرض کا تعین فرمایا۔ اپنے ساتھیوں کی ٹولیاں بنا کر ہر ایک کے حصے کی کھدائی طے کر دی۔ صحابہ کرام کے لیے خندق کی کھدائی ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ وہ نہ تو اس کام کی کوئی پیشہ ورانہ تربیت رکھتے تھے اور نہ ہی ان کو کھدائی کے مناسب آلات میسر تھے۔ اوپر سے مدینہ کی زمین بھی سنگلاخ اور پتھریلی تھی اور موسم بھی انتہائی سرد۔ لیکن قربان جاؤں صحابہ کے جذبہ سمع وطاعت پر کہ انھوں نے اپنے قائد کے حکم کو بجا لانے میں ذرا برابر بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کیا اور دنوں میں یہ معجزہ متشکل کر دکھایا۔ اور قربان جاؤں رہنمائے اعظم کی عظمت پر کہ کھدائی میں لحہ لحہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہے اور وہ کام سرانجام دیا جو کسی دوسرے ساتھی نے کیا۔ اس بڑے ہدف کے حصول کے لیے صحابہ کرام اپنے محترم قائد کے ساتھ جہاں یہ مشقت بھرا کام نہایت دلجمعی اور ہم آہنگی سے کر رہے تھے۔ گیت، ترانے، نغمے اور رزمیہ شاعری انسانی نفسیات پر خوشگوار تاثر چھوڑتے ہیں اور انسان کے اندر تروتازگی پیدا کرتے ہیں۔ تھکاوٹ، پژمردگی اور ذہنی کوفت کے خاتمے کا سبب بنتے ہیں۔ جس سے انسان کی صلاحیت کار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں ایسے ہر مشکل مرحلے پر دیگر قوموں کی طرح مسلمانوں میں بھی نغمات اور شعر گوئی کا ذکر ملتا ہے۔

امام بخاری سیدنا انس سے روایت کرتے ہیں کہ:

خندق (کی کھدائی) کے دنوں میں میں نے سنا انصار مل کر یہ شعر پڑھتے تھے۔

نَحنُ الذین بَا یَعُو محمداً   علی الجهادِ ما بقِینا اَبَدا

ہم تو پیغمبر محمدﷺ سے کر چکے ہیں یہ عہد و پیاں جان جب تک ہے، لڑیں گے کافروں سے ہم سدا

سیدنا انس بیان کرتے ہیں کہ انصار کے اس شعر کے جواب میں حضور اکرم ﷺ بنفس نفیس یہ شعر پڑھا کرتے۔

لَا عَیشِ اِلا عَیش الآ خرہ فَاغفِر الانصارَ و المُھاجرۃ

فائدہ جو کچھ ہے اور آخرت کا فائدہ ہے، بخش دے انصار اور پردیسیوں کو اے خدا!

(بخاری ، کتاب الجہاد والسیر)

□□□□□□□□

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خندق کی کھدائی کے دنوں میں یہ شعر اکثر حضور ﷺ کی زبان پر رہتا تھا صحابہ کرام کو دس دس کی ٹولیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ صحابہ کرام اپنے کام مصروف ہوتے اور رسول اللہ ﷺ ان کا معائنہ کرنے کے لیے نکلا کرتے۔ ایک دن شدید سردی تھی۔ صبح کا وقت تھا، آپ ﷺ حسب معمول معائنہ کرتے کرتے انصار کے ایک گروپ کے پاس تشریف لائے۔ صحابہ کرام مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ کئی دنوں کی محنت ومشقت کے آثار ان کے جسموں پر نظر آتے تھے۔ سہیل بن ساعدی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ مٹی اپنے کندھوں سے ڈھو رہے تھے، جسم تھکے تھکے سے تھے آنحضور ﷺ نے ہمیں دیکھا تو نعرہ لگایا۔

لَا عَیشِ اِلا عَیش الآ خرہ فَاغفِر الانصارَ و المُھاجرۃ

فائدہ جو کچھ ہے اور آخرت کا فائدہ ہے، بخش دے انصار اور پردیسیوں کو اے خدا!

آپ اندازہ لگائیں کہ کیا ہی خوبصورت شعر ہے۔

کیا ہی اعلیٰ خوشخبری ہے۔

تھکے ماندے جسموں اور مشقت کرتی روحوں کے لیے کیسا اعلان ہے کہ:

دنیا کی یہ تکلیف تو عارضی ہے۔ اصل عیش وعشرت تو وہ ہے جو اس محنت ومشقت کے نتیجے میں آخرت میں ملنے والی ہے ۔ پھر اپنی زبانِ رحمت سے سید انسانیت ﷺ اپنے پیارے صحابہ کے دونوں گروہوں یعنی انصار و مہاجرین کے لیے بخشش ومغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔ زبان رسالت کی یہ

روح افزا دعائیں، صحابہ کرام کو کتنی تسکین پہنچاتی ہوں گی، کتنی لذت دیتی ہوں گی۔

کیا خوش قسمت لوگ تھے یہ!!

سیدنا جابر کا بیان ہے کہ:

خندق کی کھدائی کے دنوں میں آپ بنفس نفیس مٹی ڈھویا کرتے تھے۔ کدال چلایا کرتے تھے اور سب کے ساتھ محنت و مشقت کے ہر کام میں برابر شریک رہتے تھے۔ ایک دن آپ ﷺ مٹی ڈھو رہے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ کا روشن و منور چہرہ اور نور سراسر جسم اطہر مٹی سے چھپ گیا تھا۔ اُس وقت آپ ﷺ کی زبان پر حضرت عبداللہ بن رواحہ کے یہ اشعار تھے۔

ان اشعار کا جو ترجمہ بخاری شریف کے مترجم علامہ وحید الزماں صاحب نے کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

(اے خدا) تو ہدایت اگر نہ کرتا تو کہاں ملتی نجات،

کیسے پڑھتے ہم نمازیں، کیسے دیتے ہم زکواۃ،

اب اتار ہم پہ تسلی، سکون و اطمینان، اے پروردگار،

پاؤں جما دے ہمارے اور لڑائی میں دے ثبات،

بے سبب ہم پر یہ دشمن ظلم سے چڑھ آئے ہیں۔

جب وہ بہکائیں ہمیں، سنتے نہیں ہم ان کی بات۔

سیّدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان اشعار کے آخری لفظ ''ابینا'' کو آپ ﷺ اونچی آواز میں ادا فرماتے اور صحابہ بھی آپ کی سُر میں سُر ملاتے جاتے۔

(بخاری ، کتاب المغازی)

□□□□□□□□

سیدنا حسان بن ثابت کو دربار رسالت ماب میں جو عزت و منزلت اور پذیرائی حاصل تھی اور انھوں

نے جس جس موقعہ پر دفاع اسلام میں جو جو اشعار کہے اور ان پر جس طرح سید انسانیت نے ان کو داد عطا فرمائی، اس سب کا تذکرہ تو اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ سیدنا حسان بن ثابت، سیدنا کعب بن مالک اور سیدنا عبداللہ بن رواحہ کے اشعار پڑھ کر جہاں ایمان کو تازگی اور روح کو تسکین حاصل ہوتی ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ فنون لطیفہ کی اس صنف کو دربار نبوی میں جو اعتماد اور رتبہ حاصل تھا وہ شاعری کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ شعرا کو رب علیم نے جو تخلیقی صلاحیت عطا کی ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس فہم کا ادراک بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ بڑا نازک فن ہے۔ اس پر سیر حاصل گفتگو کا تو یہ موقع نہیں۔ یہاں ہم شعرا کی خداداد صلاحیتوں کے صرف ایک واقعے کا تذکرہ امام بخاری کے حوالے سے کریں گے۔

ہشام بن عروہ کا بیان ہے کہ میرے والد نے بتایا کہ:

ایک دفعہ میں سیدہ عائشہ کے سامنے حضرت حسان بن ثابت کو برا بھلا کہنے لگا تو سیدہ نے مجھے روکتے ہوئے کہا، اسے برا مت کہو وہ تو اپنی شاعری کے ذریعے حضور ﷺ کی طرف سے مشرکوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ ایک دن سیدنا حسان بن ثابت نے حضور سے اجازت مانگی کہ میں مشرکین کی ہجو کرنا چاہتا ہوں، پوچھا کیسے کرو گے، اس لیے کہ میں بھی تو قریش سے ہوں تو سیدنا حسان بن ثابت نے کہا میں آپ کو ان میں سے ایسے نکال لوں گا جیسے مکھن سے بال نکال لیا جاتا ہے۔

کیا حیرت انگیز صلاحیت ہے!!!

(بخاری، کتاب المغازی)

□□□□□□□□

سیدنا کعب بن مالک کہتے ہیں کہ:

میں نے رسول اللہ ﷺ سے شعر گوئی کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔ اور اللہ کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری

جان ہے تم کافروں کو شعروں سے ایسے مارتے ہو جس طرح مجاہد تیروں سے۔

□□□□□□□□

سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ حضرت حسان بن ثابت کے لیے منبر بچھواتے اور احسان اس پر کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اظہار فخر کرتے یا حضور کی طرف سے کفار کی مذمت کرتے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ خداوند روح القدس سے حسان کی مدد فرماتے ہیں۔

□□□□□□□□

سیدہ عائشہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

شعر کلام ہے۔ اچھا شعر اچھا کلام ہے اور برا شعر برا کلام ہے۔

□□□□□□□□

حضور اقدس ﷺ کے دور مبارک میں اونٹوں کو معاشرے میں ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ سواری کے لیے، بار برداری کے لیے اور دودھ اور گوشت کے حصول کے لیے لوگوں کے پاس اونٹوں کے ریوڑ کے ریوڑ ہوتے تھے۔ اسی طرح خود، حضور ﷺ کے پاس بھی کافی اونٹ تھے، جن کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں ہمیں جا بجا ملتا ہے۔ اونٹوں کو سنبھالنے، سفر و حضر کی ضروریات کے لیے تیار رکھنے اور انھیں چلانے کے لیے پیشہ ور آدمی ملازم ہوتے تھے۔ اونٹوں کے قافلے جب چلا کرتے تو یہ لوگ نکیل پکڑ کر آگے آگے چلتے اور وقفے وقفے سے گیت گاتے ان گیتوں کو حدی کہا جاتا ہے۔ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ ایک ایسا آدمی حضور ﷺ کا ملازم تھا۔ اُس کا نام انجشہ تھا۔ وہ نہایت خوش آواز تھا ایک مشہور حدی خواں تھا۔ حدی اُس گیت کو کہتے ہیں جو اونٹوں کو ہانکنے کے لیے گایا جاتا ہے۔ ایک روز اسی طرح کے کسی سفر کے موقع پر وہ گیت گاتا اونٹوں کو ہانک رہا تھا تو حضور ﷺ

نے اُس سے فرمایا: انجشہ، آہستہ آہستہ (یعنی اپنی حدی سے ان کو گرم اور تیز رو نہ بنا) نرم و نازک آبگینوں کو کہیں توڑ نہ ڈالنا (اُن اونٹوں پر ازواج مطہرات سوار تھیں)۔

کیا خوبصورت تشبیہ ہے!!

(ماخوذ از مشکواۃ، باب البیان والشعر)

❑❑❑❑❑❑❑❑

سیدنا براابن عازب والی روایت میں جو شعر لکھے گئے ہیں، ان سے ملتے جلتے اشعار ایک اور موقع پر بھی ہمیں سنائی دیتے ہیں۔ سفر کا عالم ہے، رات کا وقت ہے، خیبر پر حملے کی مہم درپیش ہے، مجاہدین کا لشکر رواں دواں ہے۔ سیدنا عمرو بن اکوع سے صحابہ نے فرمائش کہ ہمیں اپنے شعر سنائیں۔

ملاحظہ کیجئے، کیسا ماحول بن رہا ہے!!

سیدنا عمرو بن اکوع نے اونچی آواز میں شعر سنانا شروع کر دیئے۔

سامعین میں فخر کائنات، سید عالم محمد ﷺ بھی موجود تھے۔

اشعار تو سیدنا عبداللہ بن رواحہ کے ہیں مگر انھیں عمرو بن اکوع پڑھ رہے ہیں۔

اللھم لو انت ما اھتدینا　　و لا تصدقنا و لا صلینا

فاغفر فدا لك ما ابقیا　　و ثبت الاقدام ان لا قینا

و القین سکینۃ علینا　　انا اذا صیح بنآ ابینا

اے آقا کریم:

گر نہ دیتا تو ہمیں ہدایت،

نہ پڑھتے ہم نمازیں، نہ دیتے ہم زکواۃ،

تجھ پہ ہم نے واری ، زندگی ساری،

بخش دے ہم کو، دے لڑائی میں ثبات

سکون واطمینان، ہو زندگی کا سامان
دشمن رہے چیختا،
ہمیں پکارتا، ورغلاتا،
نہیں سننے کے ہم ان کی بات، تو دے ہمیں ان سے نجات،
(بخاری، کتاب المغازی)

□□□□□□□□

اب ایک اور منظر ملاحظہ فرمائیں؛ یہ تصویر ہم نے غزوہ حنین کے موقع پر اتاری ہے۔ تاریخ اسلام میں یہ موقع نہایت بھاری، تکلیف دہ اور غم انگیز تھا۔ فتح مکہ کے بعد اہل شرک نے اپنے آپ کو حنین کی پہاڑیوں میں مجتمع کر لیا تھا تا کہ اہل توحید سے آخری معرکہ لڑا جا سکے۔ بنو ہوازن کے جنگجو کسی طور شرک کی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ سید عالم ﷺ بارہ ہزار کا لشکر جرار لے کر بنو ہوازن کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان حنین تشریف لے گئے۔ دوران سفر میں ہی، حنین کی پہاڑیوں میں مورچہ زن بنو ہوازن کے تیراندازوں نے مسلمانوں پر ناگہاں حملہ کر دیا۔ مسلمان تو ابھی صف آرا بھی نہیں ہوئے تھے کہ یہ آفت ٹوٹ پری۔ اب کیا ہونا تھا مسلمانوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ یہ غیر متوقع صورت حال فوجوں میں بھگدڑ کا باعث بن گئی۔ مسلمانوں کی اکثریت میدان جنگ سے بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ سراسیمگی، دہشت زدگی، بھگدڑ کے اس عالم میں قافلہ سالار، سید الرسل ﷺ اپنے مقام پر پیکر شجاعت بنے آہنی عزم و حوصلے کے ساتھ دشمن کے مقابل صف آرا رہے۔ لمحہ بھر کے لیے بھی آپ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ ان لحات پر حضور ﷺ کی زبان اقدس سے جو کلمات جاری تھے انھیں ابن کثیر نے یوں نقل کیا ہے۔

انا النبی لا کذب .... لوگو: میں اللہ کا سچا رسول ہوں
انا الابن عبدالمطلب .... میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں

. ا نصرت مجھ سے

للہ و کا

للھم ا نزل نصرک

میں عواتک کا بیٹا

کا سچا رسول ہوں

انا لابن العواتك
انا النبی لا كذب
انا الابن عبد المطلب .... تو میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں

(عواتک جمع ہے عاتکہ کی جو نام ہے حضور ﷺ کی دادی، پردادی اور نانی کا)

للہ

□□□□□□□□

جس جوش وعزم یقین سے قافلہ سالار نے یہ رجزیہ کلمات کہے تھے اس کا ہی نتیجہ تھا پروانے شمع کے گرد اکٹھا ہونے شروع ہو گئے۔ ٹوٹے حوصلے جڑنے لگے اور بھاگتے سپاہی واپس پلٹنا شروع ہو گئے پھر وہ گھمسان کا رن پڑا جو آخر کار مسلمانوں کی فتح پر منتج ہوا۔

□□□□□□□□

ابن ماجہ سے صاحب مشکواۃ نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے مطابق اُم المومنین سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ:

ہم نے ایک انصاری لڑکی کی شادی کرائی اور اسے رخصت کر دیا، حضور ﷺ گھر میں تشریف لائے اور پوچھا کیا لڑکی کو رخصت کر دیا گیا ہے۔ سیدہ نے جواب دیا: جی ہاں، یا رسول اللہ ﷺ، آپ ﷺ نے پوچھا؟ اُس کے ساتھ کسی گانے والی لڑکی کو بھی بھیجا ہے کہ نہیں؟ سیدہ عائشہ نے جواب دیا؛ نہیں! روایت کا اگلا حصہ ملاحظہ فرمائیں بڑا ہی دلچسپ ہے۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں، انصار ایک ایسی قوم ہے جس کو گانے کا شوق ہے، کاش تم اس لڑکی کے ساتھ کسی کو بھیجتے جو یہ اور یہ کہتا''۔ آگے حضور ﷺ نے ایک گیت کے بول دہرائے جو کہ یہ ہیں،

اتینا کم اتیناکم

فحیانا و حیاکم

ہم تمھارے پاس آئے، ہم تمھارے پاس آئے،

رکھے ہم کو وہ زندہ اور رہیں آپ بھی سدا سلامت

سبحان اللہ! کیسا دعائیہ گیت ہے۔ ہادی عالم خود گنگنا رہے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے دین میں اس طرح کے عمدہ اور شائستہ بولوں والے گیت اور اس طرح خوشی کے مواقع پر ان کا اہتمام حضور کو پسند تھا اور یہ چیز ہرگز خلاف تقوی نہیں ہے۔

□□□□□□□□

حضرت عامر بن سعد کہتے ہیں کہ میں ایک شادی میں گیا اور قرظہ بن کعب اور ابو مسعود انصاری سے ملاقات ہوئی، وہاں خواتین گا رہی تھیں۔ میں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے صحابیو اور اے اہل بدر؛ یہ سب کچھ تمھارے سامنے ہے، انھوں نے کہا: بیٹھنا ہے تو ہمارے ساتھ بیٹھو اور یہ گیت سنو اگر اس کی خواہش نہیں تو چلے جاؤ اس لیے کہ شادی کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ہمیں گیت گانے کی اجازت دی ہے۔

(مشکوٰۃ، باب النکاح، فصل سوم بحوالہ نسائی)

□□□□□□□□

حضرت عمرو بن شرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ:

ایک روز میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں امیہ بن ابی الصلت کے اشعار یاد ہیں؟ میں نے کہا؛ بہت یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: جو کچھ سناؤ۔ میں نے آپ کو کچھ اشعار سنائے آپ ﷺ نے اور سناؤ میں نے پھر سنائے، حتیٰ کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو امیہ کے ایک سو اشعار سنائے۔

سبحان اللہ! ایک سو اشعار!!

ایک بار حضور ﷺ نے فرمایا: کہ ایام جاہلیت کے شعرا میں سے صلت کا بیٹا امیہ اچھا شاعر تھا اُس کی شاعری میں توحید پائی جاتی ہے اور وہ اسلام لانے کے قریب تھا اُسی شاعر کے اشعار آپ سنتے چلے

گئے۔

گویا باوقار شعروشاعری سننا میرے محبوب آقا کو پسند تھا۔

لاکھوں درود، کروڑوں سلام آپ پراے میرے محبوب

لمعہ نور:13 تلقین اخلاق

مکہ مکرمہ کے مضافات میں سالانہ میلہ اپنے عروج پر ہے۔ ہر طرف جشن کا سماں ہے، مختلف قبائل اپنے اپنے تجارتی سامان اور ثقافتی طائفوں کے ہمراہ اپنے اپنے خیموں میں براجمان ہیں۔ کہیں شاعری کی محفلیں ہیں اور کہیں قصہ خوانی ہو رہی ہے۔ ایک طرف ڈھول کی تھاپ پر گھوڑوں کا رقص جاری ہے اور دوسری طرف نیزہ بازی ہو رہی ہے۔ اصل میں تو یہ تجارتی میلہ ہے جسے عکاظ کا بازار کہتے ہیں۔ لیکن یہ سالانہ میلا تجارت کے ساتھ ساتھ ثقافت کا پروگرام بھی بن جاتا ہے۔ یہ بازار یکم ذیقعدہ سے بیس ذیقعدہ تک طائف اور نخلہ کے درمیان ہر سال لگتا تھا۔ علاقہ بھر سے تاجر اپنی مصنوعات سمیت یہاں آتے، ہر رنگ اور نسل کا آدمی یہاں مل جاتا، تاجر بھی اور گاہک بھی اس event کے منتظر رہتے۔ عرب کے دوسرے تاجروں کی طرح مکہ کا مایہ ناز فرزند، آمنہ کا در یتیم اور وہ کہ جسے الامین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ یعنی سیدی محمد بن عبداللہ ﷺ بھی اپنا سامان تجارت یہاں لایا کرتے تھے۔ لیکن پچھلے چند سالوں سے وہ اس سالانہ میلے میں شریک تو ہو رہے تھے مگر اب سامان تجارت کے ساتھ نہیں بلکہ رب کی عبادت اور دین کی دعوت کا پیغام لے کر آ رہے تھے۔ آپ کے عزیز دوست جناب ابوبکر بن قحافہ اور پیارے چچازاد بھائی حضرت علی اور کبھی کبھار زید بن حارثہ

بھی ساتھ ہوتے۔ اللہ کریم ان سب سے راضی ہو،
مقصد کی لگن اور فرض کی ادائی کی فکر میں، محسن انسانیت کہاں کہاں نہیں گئے۔
کس کس دروازے پر دستک نہیں دی، کس کس دل کا دروازہ نہیں کھٹکایا، ہر وادی میں پہنچے۔
ہر بازار کو شرف قدم بخشا اور ہر جھونپڑی کو نورِ حق سے منور کیا۔
آپ ﷺ دوکانوں پر بھی گئے۔
گھروں اور چوپالوں کو بھی زینت بخشی۔ بیابانوں میں بھی حق کا پیغام لے کر پھرے،
مرغزاروں میں بھی پھول دعوت لے کر پہنچے۔
میں قربان ان پر بہ دل و جان ﷺ

عکاظ کے اس میلے میں اور لوگ تو اپنی اپنی خواہشات لے کر آئے تھے اور اپنے نفس کی تسکین کے لیے پھر رہے تھے، لیکن ہادی اسلام اور انسانیت کے محسن اعظم ﷺ انھی کی ہدایت کی فکر لیے گشت لگا رہے تھے۔ سیدنا علی ابن طالب فرماتے ہیں ایک بار عکاظ کے اس میلے میں ہم یونہی پھرتے پھراتے ایک مجلس میں پہنچے۔ حضرت ابوبکر صدیق بھی ہمراہ تھے۔ یہ مجلس بڑی پروقار اور بڑی پرسکون اور پر ہیبت مجلس تھی۔ اندازِ نشست سے معلوم ہوتا تھا کہ بڑے صاحب حیثیت لوگ ہیں۔ حضرت ابوبکر نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ حضرت علی کے بقول جناب ابوبکر ہر کام میں سبقت لے جانے والے تھے
جناب ابوبکر نے اُن سے پوچھا؟ آپ کس قوم سے ہیں؟
انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:

ہم بنی شیبان بن ثعلبہ سے ہیں۔ حضرت ابوبکر علم الانساب کے ماہر تھے۔ یعنی عرب قبائل اور ان کی شاخوں اور ان کے عادات و خصائل سے ماہرانہ واقفیت رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر نے رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: آپ پر میرے ماں باپ قربان، یہ لوگ اپنی قوم کے نامور اور سرپرست ہیں، ان کی طرف متوجہ ہوں اور انھیں توحید کی دعوت سے آشنا فرمائیں۔ اس مجلس میں مفروق بن عمر، ہانی بن قبصیہ، مثنیٰ بن حارثہ اور نعمان بن شریک موجود تھے۔ مفروق زبان و بیان میں طاق اور قبیلے کی طرف سے متکلم تھا۔

حضرت ابوبکر جوان کے قریب بیٹھے تھے نے کہا، تمھاری تعداد کیا ہوگی؟ مفروق نے جواب دیا ہم ہزار سے زائد مردان کار رکھتے ہیں اور یہ تعداد کسی لحاظ سے بھی کم نہیں۔ پھر ابوبکر نے پوچھا: تمھارا دفاع کیسا ہے؟ اُس نے کہا ہمارا کام جدو جہد ہے اور ہر قوم کی سعی و کاوش ہے، پھر ابوبکر نے ان سے پوچھا تمھاری لڑائی کیسی ہے؟ مفروق نے کہا کہ جب ہم غضبناک ہوتے ہیں تو لڑائی میں ہیبت ناک ہوتے ہیں ہم گھوڑوں کو اولاد پر ترجیح دیتے ہیں اور دودھیلی جانوروں سے بھی اسلحہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پھر بھی فتح اور شکست اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لیے کبھی ہم فتح یاب ہوتے ہیں تو کبھی مخالف۔

حضرت ابوبکر کے اس قسم کے سوالات کا پس منظر یہ تھا کہ آپ ﷺ کی زندگی کے آخری زمانے میں اہل مکہ کی ہدایت سے مایوس ہو کر کسی دوسرے قبیلے میں ہجرت کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے اور کسی ایسے قبیلے کی تلاش میں تھے جو قوت و استبداد کا مالک ہو۔ چونکہ میلے کے موقع پر تمام قبائل آئے ہوتے تھے اس لیے اس میلے کے موقع پر وہ مختلف قبائل سے مل کر ان کی جنگی اور دفاعی صلاحیت کا اندازہ لگانا چاہتے تھے۔

حضرت ابوبکر کے ان سوالات نے یہ حکمت تبلیغ سکھائی کہ:

مخاطب سے مکمل تعارف حاصل کریں۔

اپنی بات کا موقع نکالیں جاتے ہی اپنی دعوت شروع نہ کر دیں۔

مخاطب کی دلچسپی کے موضوع سے بات شروع کی جائے، جس طرح سیدنا ابوبکر نے ان کے خاندانی وقار اور جرأت و بہادری کی باتوں سے انھیں اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔

اسی اثناء میں اہل مجلس کے اندر ان نوواردوں کے بارے میں دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔

یوں مفروق شیبانی نے قدرے کھلتے ہوئے پوچھا؟ آپ غالباً قریش سے ہیں۔

حضرت ابوبکر نے ہاں میں جواب دیا، اور ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

اگر آپ لوگوں نے کسی پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے تو وہ یہی ہیں۔

اب مفروق شیبانی اور ان کے ساتھیوں کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔

اس نے کہا: ہاں ہمیں اب اندازہ ہو گیا ہے کہ یہی وہ قریشی ہیں جو نبوت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔
میں قربان جاؤں اس قریشی وہاشمی پر، (خالد عاربی)
پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ ﷺ اس کے قریب ہو گئے۔
حضرت ابو بکر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر کپڑا تان لیا غالباً دھوپ پڑ رہی ہوگی۔
آپ ﷺ نے اپنی رس گھولتی زبان اقدس سے مفروق اور اس کے ساتھیوں کو مخاطب کیا اور ارشاد فرمایا؛

"میں آپ لوگوں کو لا الہ الا اللہ کی دعوت پیش کرتا ہوں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ آپ لوگ اس پیغام کو قبول کر لیں، میرے دست و بازو بنیں، اپنے وسائل اور اپنی توانائیاں مجھے مہیا کریں تا کہ میں لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا سکوں۔ قریش نے اللہ کے پیغام کی مخالفت کی ہے، اس کے رسول کی تکذیب کی ہے اور پیام حق سے بے اعتنائی برتی ہے اللہ تعالیٰ ہی بے نیاز ذات ہے اور حمد و ستائش کے لائق ہے"۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

مفروق نے پوچھا؟ اے برادران قریش، آپ اور کس بات کی تلقین کرتے ہیں؟
آپ ﷺ نے قرآن کی درج ذیل آیات تلاوت فرمائیں۔ ذرا تصور فرمائیں، کیا خوب صورت منظر ہوگا، جب اللہ کے پیارے رسول اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ کلام الٰہی کی تلاوت فرما رہے ہوں گے۔
ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا

بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (151) وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْساً إِلَّا وُسْعَهَا وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ أَوْفُوا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَO

ترجمہ:

آپ کہیے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں (جن کی مخالفت) کو تمھارے رب نے تم پر حرام فرما دیا ہے۔وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کرو، ہم تم کو اور ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ اعلانیہ ہوں خواہ پوشیدہ۔اور جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق کے ساتھ، ان کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تا کہ تم سمجھو۔اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو کہ مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔اور ناپ تول پوری کرو انصاف کے ساتھ، ہم کسی شخص کو اس کی طاقت کے خلاف تکلیف نہیں دیتے۔اور جب تم بات کرو تو انصاف کے ساتھ کرو، گو وہ شخص تمھارا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا ہے اس کو پورا کرو، اس کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تا کہ تم یاد رکھو۔

(سورۃ الانعام: ۱۵۱۔۱۵۲)

❑❑❑❑❑❑❑❑

مفروق شیبانی نے کہا: واللہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو ہم یقیناً اسے پہچان لیتے، اُس نے پھر پوچھا: علاوہ ازیں آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔

تب رسول اللہ ﷺ نے اُن کے سامنے سورہ نحل کی یہ آیت تلاوت فرمائی

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَاء ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ○

ترجمہ:

اللہ تمہیں عدل کا، بھلائی کا اور قرابتداروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں، ناشائستہ حرکتوں اور ظلم و زیادتی سے روکتا ہے۔ خود تمہیں نصیحتیں کر رہا ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

(سورۃ النحل: ۹۰)

❑❑❑❑❑❑❑❑

یہ سن کر مفروق نے کہا:

واللہ اے برادر قریش؛ آپ عمدہ اخلاق اور نیک اعمال کی تلقین کرتے ہیں۔ آپ کی تکذیب و مخالفت کرنے والے یقیناً جھوٹے ہیں۔

اس گروہ نے اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو قبول تو نہ کیا البتہ دعوت اور پیام حق کی تعریف و توصیف ضرور کی۔ تاریخ میں آتا ہے کہ وہاں سے آپ ﷺ اگرچہ مایوس لوٹے مگر آپ ﷺ نے دعوت حق کے کام کو ترک نہ کیا اور ہر ایسے موقعے پر اپنا پیغام سنانے تشریف لے جاتے رہے۔ حتیٰ کہ اسی طرح کے دعوتی دوروں میں ہی آپکی ملاقات اہل یثرب سے ہوئی جو آخرکار ہجرت مدینہ پر منتج ہوئی۔ اس واقعے سے یہ درس ملتا ہے کہ عمدہ اخلاق، صلہ رحمی اور والدین پر احسان کرنے کی تلقین

،ایک دوسرے کے ساتھ عدل واحسان کی ترغیب اور اسی قسم کے دیگر حسنات واخلاقیات کی تعلیم وتبلیغ آقا ﷺ کے فرائض منصبی میں شامل اور آپ ﷺ کی بنیادی دعوت کا اہم حصہ تھی۔

اے عمدہ اخلاق، صلہ رحمی اور والدین پر احسان کرنے کی تبلیغ کرنے والے
نبی، تجھ پر اس عاجز امتی کی طرف سے لاکھوں درود اور لاکھوں سلام۔

لمعہ نور:14 آسان دین

حضرت ابوسعید خدری کا بیان ہے کہ:

ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عورت حاضر ہوئی اور عرض کیا میرا شوہر صفوان بن معطل مجھے مارتا ہے جب میں نماز پڑھتی ہوں۔ جب روزہ رکھتی ہوں تو تڑوا دیتا ہے۔ اور فجر کی نماز اس وقت پڑھتا ہے جب سورج نکلنے والا ہی ہوتا ہے۔راوی کا بیان ہے کہ اُس وقت دربارِ اقدس میں صفوان بن معطل بھی موجود تھے۔آپ ﷺ نے اُن سے حقیقت دریافت کی۔اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جب یہ نماز پڑھتی ہے تو اُس کو بہت ہی لمبا کر دیتی ہے بڑی بڑی سورتیں پڑھتی ہے میں اس کو بس اس بات سے منع کرتا ہوں۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے صفوان کی بیوی سے کہا؛نفل نماز میں سورہ فاتح کے ساتھ کی ایک سورت ملا لینا کافی ہے۔(یعنی غیر ضروری طور پر لمبی قرأت نہ کریں)۔پھر صفوان بن معطل نے عرض کی کہ اور اس کا یہ کہنا کہ میں اس کا روزہ تڑوار دیتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ (نفل) روزہ رکھتی ہے تو متواتر رکھتی چلی جاتی ہے اور میں ایک جوان آدمی ہوں زیادہ صبر نہیں کرسکتا۔یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے۔اس کے بعد صفوان نے عرض کی،اور اس کا یہ کہنا کہ میں

صبح کی نماز بہت دیر سے پڑھتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ رات کو کام کرتے ہیں جس سے ہم کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ سورج نکلنے کے وقت ہی بیدار ہوتے ہیں۔ رسول رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ صفوان جس وقت آنکھ کھلے نماز پڑھ لو۔

کیسی عمدہ بات ہے!!

آج کا کوئی میری طرح کا وعظ ہوتا تو اُن کو اس طرزِ عمل پر ضرور ڈانٹتا۔

آپ ﷺ خود تو بلاشبہ بہت زیادہ نفلی عبادت کرنے والے تھے، لیکن اپنے غلاموں کی یہی تربیت کی کہ نفلی عبادت میں میانہ روی اختیار کرنا چاہیے۔ اور دیگر انسانی حقوق کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ یہاں خاتون محترم کو نفلی عبادت کم کرنے کا حکم دیا ہے جب کہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے یہی ہدایت مرد صحابہ کو بھی فرمائی۔ دین اسلام نے ہر موقع پر میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ دین نے باہمی حقوق فرائض کا تعین کر دیا ہے۔ اور اُن کو پورا کرنے کی تعلیم وترغیب بھی دی ہے۔ باہمی حقوق کی اس ادائی کا نام ہی تقویٰ ہے۔ اور یہی سنت پیغمبر ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دین اسلام میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے جس سے لوگ حرج اور دشواری میں مبتلا ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

(سورہ الحج ؛ ۷۸)

❑❑❑❑❑❑❑❑

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتا ہے۔ وہ تمہیں مشکل میں ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

(سورہ البقرہ ۔ ۱۸۵)

❑❑❑❑❑❑❑❑

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف نہیں کرتا

(البقرہ۔۲۸۶)

□□□□□□□□

سیدہ عائشہؓ کا بیان ہے کہ:

حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون کو طلب فرمایا؛ سیدنا عثمان بن مظعون اولین مسلمانوں میں سے تھے۔ یہ وہ صحابی ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق کی دعوتی کوششوں سے مسلمان ہوئے تھے۔ جب وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا؟ اے عثمان کیا تم میرے طریقے کو پسند نہیں کرتے۔ یہ بڑا ہی سخت سوال تھا جو رسول محترم نے اپنے اس صحابی سے کیا۔ وہ یقیناً کانپ گئے ہوں گے۔ سیدنا عثمان نے عرض کی! نہیں، نہیں یا رسول اللہ ﷺ ایسے کس طرح ممکن ہے۔ اللہ کے رسول خدا کی قسم ایسا نہیں ہے۔ بلکہ میں تو آپ کے طریقے ہی کو پسند کرتا ہوں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں۔

نفل روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔

عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اور اُن کی ذمہ داریاں بھی ادا کرتا ہوں۔

اے عثمان: اللہ سے ڈرو!

تمھاری اہلیہ کا بھی تم پر حق ہے،

تمھارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے،

اور خود تیرے نفس کا بھی تم پر حق ہے،

بھی رکھو   ناغہ بھی کر   نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو۔

(سنن ابی داؤد)   ۔   و

اروزہ   لہٰذ

□□□□□□□□

ہمارا دین نہایت سادہ، سہل اور آسانیاں فراہم کرنے والا ہے۔اس میں باہمی حقوق فرائض کا بھی تعین کر دیا گیا ہے۔اوران کی ادائی کی ترغیب وتلقین بھی کی جاتی ہے۔سنن ابوداؤد کی اس روایت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات کچھ ادھوری سی ہے۔سیدنا عثمان بن مظعون کو خصوصی طور پر طلب کر کے اللہ کے رسول نے اس انداز سے بات کیوں فرمائی ہے۔شاید وہ نفل نماز میں اس حد تک مشغول رہتے تھے کہ ان کی سماجی اور خانگی ذمہ داریوں میں فرق پڑ رہا تھا۔مسند احمد کی اس قسم کی ایک روایت میں تفصیل مذکور ہے جس سے بات صاف ہو جاتی ہے اور معاملہ یہی واضح ہوتا ہے جس کا شک ہم نے اوپر ظاہر کیا ہے۔امام احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں کہ:

انھوں نے یہ قصہ سیدہ عائشہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

وہ فرماتی ہیں ایک دن خویلہ بنت حکیم جو عثمان بن مظعون کی زوجہ تھیں ۔وہ میرے پاس آئیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو بہت ابتر حال میں دیکھا، آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا؛ اے عائشہ خولہ کیوں اس طرح ابتر حال میں ہے۔سیدہ عائشہ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ یہ اپنے شوہر عثمان کی شکایت لے کر آئی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ وہ ان پر توجہ نہیں دیتے، ساری ساری رات نفل نماز پڑھتے ہیں اور دن کو روزے سے ہوتے ہیں۔اور کئی کئی ماہ تک متواتر روزے رکھتے ہیں۔آپ انھیں سمجھائیں۔یہ سن کر رسول اکرم ﷺ نے انھیں طلب فرمایا اور وہ کچھ ارشاد فرمایا جو اوپر نقل کیا گیا ہے۔اور کس خوبصورت انداز میں آپ نے اپنے گھر والوں، آئے گئے مہمانوں اور خود اپنی جان کے حقوق کو پورا کرنے کی ترغیب دی اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ یہی میرا طریقہ، یہی میری سنت ہے۔

□□□□□□□□

سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ جب صحابہ کو کسی عمل کا حکم دیتے تو ایسے عمل کا حکم دیتے جس کو وہ آسانی سے ادا کر سکیں (یعنی وہ مشکل اور دشوار گزار عبادتوں کا حکم نہ دیتے) ایک بار صحابہ نے کہا: کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کی مثل نہیں ہیں، لاریب اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے ذنوب کی مغفرت کر دی ہے (یعنی آپ کے لیے تو قلیل عبادت بھی کافی ہے، ہمیں زیادہ عبادت کرنی چاہیے)۔اس پر رسول اللہ ﷺ ناراض ہوئے حتیٰ کہ آپ کے چہرہ مبارک پر ناراضگی کے اثرات ظاہر ہوئے اور فرمایا؛ تم میں سے سب سے زیادہ متقی اور تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا میں ہوں۔

□□□□□□□□

بخاری کی ایک اور روایت میں سیدہ عائشہؓ کا بیان ہے کہ:
وہ حضور ﷺ کا اسوہ بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ آپ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب آپ کو دو کاموں میں سے ایک کام کا اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ پر عمل کرتے جو زیادہ آسان ہوتا۔ بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ ﷺ سب سے زیادہ اس سے بچنے والے تھے۔

□□□□□□□□

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ:
نبی اکرم نے ارشاد فرمایا دین آسان ہے جو شخص دین پر غالب آنے کی کوشش کرے گا (یعنی آسان طریقہ کو چھوڑ کر مشکل طریقہ اختیار کرے) دین اُس پر غالب آجائے گا۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور معاذ بن جبل کو یمن روانہ کرتے ہوئے فرمایا: لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا، انھیں مشکل میں نہ ڈالنا، خوشخبری دینا، انھیں متنفر نہ کرنا اور آپس میں موافقت پیدا کرنا۔

خیال رہے کہ جن امور میں نرمی کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ حقیقت میں نفلی عبادات کے معاملہ میں ہے۔فرض عبادات میں اگر چہ اللہ کریم نے سہولت اور نرمی کا رویہ اختیار فرمایا ہے۔لیکن یہ سہولت اور نرمی دوسری طرز کی ہے۔کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان بھی رہے اور دین کے عائد کرتا فرائض و واجبات سے مجھے رخصت دی جائے۔اُس رخصت کے مواقع کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے واضح بیان فرما دیا ہے اور اس میں بندوں کی مختلف حالتوں کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔جیسے سفر کی حالت میں فرض نماز اور روزوں میں رعایت دیجاتی ہے۔لیکن بہر حال فرض کسی طور بھی ساقط نہیں ہوتا۔اس کو کوئی آدمی سختی سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم عقلی ہے۔

□□□□□□□□

سیدنا ابو سعید خدری کا بیان ہے کہ:
ہم لوگ رمضان کے مہینے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگوں میں جاتے تھے،تو ہمارے کچھ ساتھی روزہ رکھ لیتے اور کچھ نہ رکھتے،روزہ دار غیر روزہ داروں پر ناراض نہ ہوتے اور نہ ہی غیر روزہ داران پر رنجیدہ ہوتے۔سب کا نقطہ نظر یہ ہوتا کہ جو ہمت رکھتے ہیں وہ سفر میں روزہ رکھ لیں اور جو اپنے میں ہمت نہیں پاتا وہ نہ رکھیں،دونوں میں کچھ فرق نہیں۔

□□□□□□□□

سفر میں کبھی رسول اللہ ﷺ روزہ رکھ لیتے تھے اور کبھی نہیں بھی رکھتے تھے۔آپ ﷺ کی پیروی میں صحابہ کرام بھی ایسا ہی کرتے تھے۔فتح مکہ کا سفر بھی رمضان میں ہوا تھا۔ہوا یوں کہ اس سفر میں ایک دن رسول اللہ ﷺ نے روزہ رکھ لیا،کچھ صحابہ نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا،دن گرم ہو گیا روزہ داروں کا سفر اور گرمی سے برا حال ہو گیا،رسول رحمت ﷺ نے جب اس بات کو محسوس کیا اور آپ عسفان پہنچے تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا،راوی کا بیان ہے اونٹنی پر بیٹھے بیٹھے ہی آپ ﷺ نے دن کی روشنی میں ہی سب صحابہ کے سامنے وہ پانی پیا،راوی کو شک تھا کہ شاید وہ دودھ ہو،آپ کے اس عمل کو دیکھ

کر روزہ دار صحابہ سے کہا کہ تم بھی اپنا روزہ کھول لو۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

اسی طرح کے ایک موقع پر جب آپ کا روزہ نہیں تھا۔آپ کے ان صحابہ نے جن کا روزہ نہیں تھا کہا کہ وہ روزہ داروں کی خدمت کریں۔حضور ﷺ خود بھی اس میں شامل ہوئے۔غیر روزہ داروں نے جب روزہ داروں کی خوب خدمت کی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آج تو سارا ثواب وہ لوٹ کر لے گئے جو روزے سے نہ تھے۔

(بخاری، باب فضل الخذمہ فی غزوات)

❑❑❑❑❑❑❑❑

کیا ہی عمدہ نمونہ عطا کیا ہے خیر البشر ﷺ نے !!

سفر میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت خود اللہ کریم نے عطا فرمائی ہے۔اور اس عنایت خسروانہ کا تذکرہ قرآن کی سورہ بقرہ میں ہوا ہے۔اس موقع پر رب تعالیٰ نے وہ عالیشان ضابطہ عطا فرمایا جو ہم قبل ازیں نقل کر چکے ہیں۔یہاں ایک بار پھر پڑھنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں،

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتا ہے اور تمہیں مشکل میں ڈالنے کا ارادہ نہیں فرماتا''۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

سیدنا عبداللہ بن عمر بن عاص کا بیان ہے کہ:

میں ہمیشہ روزے رکھتا تھا اور ہر رات قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا۔رسول اللہ ﷺ کے سامنے میرا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے مجھے طلب اور دریافت فرمایا میں ایسا اور ایسا سنا ہے؟ میں نے عرض کی یا

رسول اللہ ﷺ میں ایسا ہی کرتا ہوں اور اس سے خیر کا طالب ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: تمھارے لیے صرف یہ کافی ہے کہ تم کہ مہینے میں تین روزے رکھ لیا کرو، میں نے عرض کیا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔

آپ ﷺ نے فرمایا دیکھو!

تمھاری بیوی کا تم پر حق ہے،

تمھارے مہمان کا تم پر حق ہے،

تمھارے جسم کا تم پر حق ہے،

پھر اگر تم چاہتے ہو تو داؤد والے روزے رکھ لو وہ لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے، میں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ اللہ کے نبی داؤد کیسے روزہ رکھتے تھے، آپ ﷺ نے جواب دیا ایک دن روزہ رکھتے ایک دن افطار کرتے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر ماہ میں ایک قرآن ختم کیا کرو، میں نے عرض کیا؛ اے اللہ کے رسول ﷺ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا پھر بیس دن میں کرلو، میں نے عرض کیا مجھ میں اس سے افضل کی طاقت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا چلو دس دن میں قرآن ختم کرلیا کرو، میں نے عرض کیا مجھ میں اس سے افضل عمل کی طاقت ہے، تب آپ ﷺ نے فرمایا: سات دن میں ختم کرلیا کرو اس سے زیادہ اپنے آپ کو مشقت میں مت ڈالو۔ کیونکہ تمھاری بیوی کا تم پر حق ہے، اور شاید تمھاری عمر لمبی ہو پھر تم اس پر عمل نہ کرسکو گے۔ حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے اوپر سختی کی تو پھر مجھ پر بھی سختی کی گئی۔ پھر میں اس عمر کو پہنچ گیا جس کی نشاندہی حضور اکرم ﷺ نے فرمائی تھی۔ اور اب جبکہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں تو میں سوچتا ہوں کاش میں نبی ﷺ کی عطا کردہ رخصت کو قبول کرلیا ہوتا!!

□□□□□□□□

بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ:

صحابہ میں سے ایک صاحب نے فیصلہ کیا کہ میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے

یہ فیصلہ کیا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں کبھی شادی نہ کروں گا عورت سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا، رسول اللہ ﷺ تک ان کی یہ بات پہنچی تو آپ ﷺ نے اُن کو بلا کر ارشاد فرمایا؛ خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تقویٰ اختیار کرتا ہوں، مگر میری سنت اور میرا طریقہ یہ ہے کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، پس جس کو میرا طریقہ پسند نہ ہو اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

حضرت حذیفہ کا بیان ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛ کسی مسلم کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ذلیل کرے پوچھا گیا کوئی اپنے آپ کو کیسے ذلیل کر سکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: کہ وہ ایسی بلا سے تعرض کرے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔

لاکھوں درود آپ پر کروڑوں اسلام آپ کے لیے،

اے رسول رحمت ورافت،

سہولتیں عنایت کرنے والے رسول محترم،

اللھم صلی علی محمد و علی محمد و بارک و سلم علیہ

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ؛

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں (یعنی ہماری اتباع کرنے والا نہیں) جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے، نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے نہ روکے"۔

(ترمذی، باب شفقت)

❑❑❑❑❑❑❑❑

ان سطور کا عاجز راقم جب دسویں جماعت (۱۹۷۲) میں تھا تو میٹرک کے اس وقت کے اسلامیات کے نصاب میں یہ حدیث مبارکہ درج تھی۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے ہمارے استاد محترم نے جو کچھ کہا تھا، آج بھی کانوں میں گونج رہا ہے کہ "لوگ اگر اس فرمان نبوی پر عمل کر لیں تو ان کی دنیا و آخرت سنور سکتی ہے"۔ یہ اس شکل میں ہے کہ چھوٹا صرف عمر میں ہی نہیں ہوتا بلکہ سماجی اور معاشرتی اعتبار سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر معاشرے میں اپنے سے کمتر لوگوں سے شفقت کا رویہ

اپنا لیا جائے، اور اپنے بڑوں سے (عمر اور منصب میں بڑوں) کی توقیر و عزت کی جائے تو پھر آخر فساد کیسے رونما ہوگا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ لوگ ایک دوسرے کو اچھی بات کی ترغیب بھی دے رہے ہوں اور برائی سے بھی روک رہے ہوں۔ تو سکون کیوں نہیں آ سکتا۔ بہر حال آیئے ذیل میں صرف چھوٹوں پر شفقت کے ضمن میں سیدنا خیر البشر ﷺ کا اسوہ ملاحظہ کرتے ہیں۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

سیدنا عبداللہ ابن عباس کا بیان ہے کہ:

ایک دفعہ بہت سے صحابہ رسول اللہ ﷺ کے دربار میں حاضر تھے۔ اتنے میں کوئی پینے والی چیز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائی گئی۔ آپ ﷺ سب سے پہلے اس پیالے سے خود پیا۔ پھر آپ ﷺ نے دوسروں کو پلانے کا عندیہ ظاہر کیا۔ میں حضور ﷺ کے دائیں طرف بیٹھا تھا جب کہ میں ابھی بچہ تھا۔ دیگر بزرگ صحابہ نبی اکرم ﷺ کے بائیں جانب بیٹھے تھے، حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا: اگر تیری اجازت ہو تو بائیں جانب بیٹھے ہوئے بڑے لوگوں کو دے دوں؟ (آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ ہر کام دائیں جانب سے شروع کرتے تھے)۔ اب ننھے عبداللہ کا بیان ملاحظہ فرمایے، وہ کہتے ہیں، نہیں یا رسول اللہ آپ کا جوٹھا پینے کی جو سعادت مجھے ملنے والی ہے وہ کوئی اور لے جائے یہ مجھے منظور نہیں۔ حضور ﷺ مسکرا دیئے اور ننھے عبداللہ کو اس سعادت سے محروم نہ کیا۔

ہمارے پیارے رسول ﷺ بچوں پر بہت شفقت اور پیار نچھاور کیا کرتے تھے، گلی محلے میں جہاں بچے مل جاتے، اُن کو روک کر سلام کرتے، اُن کے سروں پر رحمت بھرا ہاتھ رکھتے، اُن سے پیار کرتے، اور بعض اوقات ان سے ہلکا پھلکا مزاح بھی فرماتے۔ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ ایک دن سید انسانیت ﷺ مسجد سے نکل کر گھر کی طرف جا رہے تھے کہ گلی میں کھڑے بچوں نے آپ ﷺ کو گھیر لیا حضرت جابر بن سمرہ بھی ان بچوں میں شامل ہو گئے۔ آپ ﷺ نے سب بچوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ سیدنا جابر کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ مبارک سے ایسی خوشبو اور ٹھنڈک محسوس ہوئی جیسے یہ ہاتھ ابھی ابھی کسی خوشبو کی نہر سے دھل کر نکلا ہو۔

اگر آپ ﷺ سواری پر ہوتے اور راستے میں کوئی بچہ مل جاتا تو آپ اسے اپنے ساتھ سوار کر لیتے۔

ایک دن پیارے رسول ﷺ کسی سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ شہر سے باہر ہی سیدنا جعفر طیار کے بیٹے عبداللہ بن جعفر کھیلتے ہوئے مل گئے۔ حضور ﷺ اونٹ پر سوار تھے بچہ چچا چچا کہتے حضور کی طرف بھاگا۔ آپ نے اونٹ روکا، اسے بٹھایا اور اسے اپنے آگے سوار کر لیا۔ ابھی کچھ دور گئے تھے کہ سیدہ فاطمہ کا لال بھی مل گیا۔ اس کے لیے دوبارہ اونٹ کو بٹھایا اور اسے بھی سوار کر لیا۔ حضور ﷺ کے زمانے میں عرب کے لوگ بیٹیوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ بیٹیوں کو باپ نہ تو پیار دیتے نہ سینے سے لگاتے۔ نہ ان کے لاڈ اٹھاتے اور نہ ہی اپنے پاس بیٹھنے دیتے۔ بعض لوگ اس حد تک شقاوت قلبی کا مظاہرہ کرتے کہ ان معصوم کلیوں کو اپنے ہاتھوں سے مسل ڈالتے۔ اور ان پاک روحوں کو زندہ درگور کر دیتے۔ یہ شقاوت اور سنگدلی وہ اپنی ہی لختِ جگر کے ساتھ کرتے۔ اسلام آیا تو دفن ہوتی بچیوں کو حیات نو نصیب ہوئی۔ بیٹی گھر بھر کے پیار کا مرکز ٹھہری۔ اسلام آیا تو ان بچیوں کو شرف آدمیت نصیب ہوا۔ خود ہادی عالم ﷺ کی اپنی چار بیٹیاں تھیں۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ بے حد پیار کیا اُن کے لاڈ اٹھائے، اُن کو پالا پوسا اور ان کی خوبصورت تربیت کی۔ ان کے لیے دکھ اٹھائے اور ان بچیوں کو حسن کردار سے مزین کیا۔ آپ نے جس طریقے سے اپنی ان بیٹیوں پر شفقت و رافت نچھاور کی، یہ رہتی دنیا تک ایک مثال بن گئی کہ بیٹی بھی چاہے جانے کے لائق ہستی ہے۔ یہ بھی نسل انسانی کا شرف ہے اور یہ انسان کے جگر کا ٹکڑا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ سیدہ فاطمہ جب اپنے ابا کے حضور حاضر ہوتیں تو آپ ﷺ کھڑے ہو کر بیٹی کا استقبال کرتے۔ ان کے لیے جگہ بناتے اور اپنی کالی کملی سیدہ کے بیٹھنے کے لیے بچھاتے۔ ان کی بات توجہ سے سنتے اور حتی الوسع ان کے مطالبات کو پورا فرماتے۔ بیٹی کا یہ اعزاز و اکرام بلاشبہ سنت پیغمبر ہے۔ مدینہ طیبہ کے کسی گھر میں بچہ پیدا ہوتا تو والدین کی خواہش ہوتی کہ نومولود کو حضور ﷺ کی خدمت میں لایا جائے اور آپ سے برکت حاصل کی جائے۔ ایسے بہت سے واقعات حدیث و سیرت کی کتابوں میں رپورٹ ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ بچے کو گود میں لیتے، پیار کرتے، کبھی ان کے کان میں اذان دیتے اور کبھی کھجور چبا کر بچے کے منہ میں ڈالتے۔ بعض اوقات بچوں کے نام بھی

تجویز کرتے۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر وہ پہلا بچہ ہے جو ہجرت کے بعد مہاجرین کے ہاں پیدا ہوا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سالی سیدہ اسماء کا بیٹا تھا۔ سیدنا صدیق اکبر نے بچے کے کان میں اذان کہی کہ آپ اُس کے نانا تھے۔

پھر اس کو گود میں اٹھائے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے اسے گود میں لیا اور فرمایا کھجور لاؤ۔ کھجور لائی گئی۔ حضور ﷺ نے اس کو اپنے دہن مبارک میں رکھ کر چبایا اور لعاب مبارک بچے کے منہ میں ڈال دیا اور ارشاد فرمایا اس کا نام عبداللہ ہے۔ اسی طرح سیدنا انس کے بھائی کا نام بھی آپ عبداللہ رکھا تھا۔ سہیل بن حنیف کے بیٹے کا نام سعد تجویز فرمایا میں اس کا نام اس کے نانا کے نام پر کھتا ہوں۔ نومولد کے نانا حضرت سعد بن زرارہ ایک بلند پایہ صحابی تھے۔ حضور ﷺ کی مدینہ آمد سے پہلے یہ مسلمانوں کو باجماعت نماز پڑھایا کرتے تھے۔ اسی طرح کئی ایسے بچے ہیں جن کا نام آپ نے تجویز فرمایا اور بعض لوگوں کے نام کو تبدیل کیا۔ ایک دفعہ سیدہ اُم قیس اپنے نومولد بچے کو حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں لائیں۔ آپ ﷺ نے اس بچے کو اپنی مبارک گود میں اٹھا لیا۔ اسے پیار کیا۔ بچے نے آپ کی گود میں پیشاب کر دیا۔ سید عالم اور رسول رحمت ﷺ نے اس بات کا ذرا بھی برا نہ منایا۔ بالکل ناراض نہ ہوئے، بچے کو ماں کے سپرد کیا اور پانی منگوا کر اپنے کپڑوں کو پاک کر لیا۔ روایات میں اس طرح کے کئی واقعات ذکر ہوئے ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسے ہر موقع پر حضور ﷺ کے چہرہ انور پر کبھی بھی ناراضگی کے آثار ظاہر نہ ہوئے۔ بلکہ ایک دفعہ تو اس طرح کے واقعہ پر خاتون نے پیشاب کرنے والے بچے کو ڈانٹا تو آپ ناراض ہوئے اور فرمایا مجھے اس سے تکلیف ہوئی ہے کہ تو نے معصوم کو ڈانٹا۔

کیا ہے کوئی امتی، اس معیار پر پورا اترنے والا؟؟

ہے کوئی اسوہ نبی کی پیروی کرنے والا؟؟

حضرت انس رسول اللہ ﷺ کے ذاتی خادم تھے۔ دس سال کی عمر میں ہی وہ حضور ﷺ کی خدمت میں آ گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان دس سالوں میں کوئی ایک بھی موقع ایسا نہیں آیا کہ حضور ﷺ نے مجھے جھڑکا ہو یا سخت سست کہا ہو۔ حالانکہ میں بچہ تھا، غلطیاں بھی کر جاتا تھا۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے

مجھے ایک کام پر بھیجا۔ میں راستے میں بچوں کو کھیلتے دیکھ کر بھول گیا اور بچوں کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ حتیٰ کہ خود رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور محبت سے میرا کان پکڑ کر صرف اتنا کہا کہ تجھے تو میں کام پر بھیجا تھا۔ تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ میں نے عرض کی؛ وہ بات تو مجھے بھول ہی گئی تھی۔ ابھی جاتا ہوں حضور! ﷺ

یہی سیدنا انس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اکثر مجھے بیٹا کہہ کر پکارتے، ایک بار مجھے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا؛ اے بیٹے جب تو گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کہا کرو۔ یہ تیرے لیے اور تیرے گھر کے لیے برکت کا باعث ہوگا۔ اپنے اس خادم پر آنجناب اتنے شفیق تھے کہ اس کی دلجوئی کے لیے کبھی کبھار اس کے گھر بھی تشریف لے جاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بار حضور ﷺ ہمارے گھر میں تشریف لائے اور فرمایا آؤ میں تمہیں نماز پڑھاؤں۔ سیدنا انس کہتے ہیں کہ گھر میں ایک پرانی چٹائی تھی میں نے اسے دھو کر خشک کر لیا اور پھر اسے ایک کونے میں بچھا دیا۔ پھر حضور ﷺ نے ہم سب گھر والوں کو نماز پڑھائی۔ سیدنا انس کو حضور ﷺ کبھی کبھی دو کانوں والا کہہ کر پکارتے۔ کیونکہ ان کے کان قدرے بڑے تھے۔ کبھی کبھی آپ انھیں سر کے بالوں سے پکڑ لیتے تھے۔ غرض ملازمین کے ساتھ آپ کا رویہ پیار بھرا اور ایک قسم کی بے تکلفی لیے ہوئے تھا۔ شفقت، محبت، رافت اور ملائمت گویا آپ ﷺ کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی اور میں تو کہتا ہوں کہ آپ کے رویے اور طرز عمل سے ہی یہ الفاظ اپنے معنی سے آشنا ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی اپنی اولاد نرینہ زندہ نہ رہ سکی البتہ بیٹیاں بڑی ہوئیں۔ ان کی شادیاں کیں اور اللہ نے ان کو اولاد سے بھی نوازا۔ اپنے نواسے نواسیوں سے حضور ﷺ کو بہت پیار تھا۔ آپ کے نواسوں، سیدنا حسن بن علی اور سیدنا حسین بن علی نے تاریخ میں بڑا نام کمایا۔ ان دونوں کے بچپن کے کچھ واقعات تاریخ نے محفوظ رکھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ مسجد نبوی میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ سامنے سے سیدنا حسن یا سیدنا حسین آتے دکھائی دیئے۔

دھوپ اور گرمی سے ان کے پاؤں جلتے تھے، اور کپڑے پیروں میں الجھتے تھے اور وہ گر گر پڑتے تھے حضور ﷺ کی نظر مبارک اُن پر پڑی تو فرط محبت سے آپ ﷺ نے خطبہ چھوڑ دیا اور لپک کر بچے کو

اٹھالیا۔ سینے سے لگایا اور واپس منبر پر تشریف لا کر دوبارہ خطبہ شروع فرمایا۔ ایک دفعہ سید الرسل ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ کی نواسی سیدہ امامہ بنت زینب سجدے کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی کمر پر سوار ہو گئی۔ ہمارے پیارے رسول ﷺ نے اُس وقت تک سر نہ اٹھایا جب تک وہ بچی خود بخود نیچے نہ اتر گئی۔ اسی طرح کا واقعہ سیدنا حسین سے بھی منسوب ہے۔ اس موقع پر صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے آج اتنا لمبا سجدہ کیوں کیا؟

جواب میں فرمایا: میرا بیٹا میری پیٹھ پر سوار ہو گیا تھا، سوچا وہ اپنا شوق پورا کر لے۔ بعض اوقات حضور ﷺ اپنے ان نواسوں کو اپنے کندھے پر سوار کر لیتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر جب آپ ﷺ نے اس شہزادوں میں سے کسی ایک کو کندھے پر اٹھایا ہوا تھا تو ایک صحابی سیدنا جابر نے کہا واہ! ان بچوں کو کیسی عمدہ سواری میسر ہے۔ حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: یہ بھی تو دیکھو کہ سوار کس عظمت کے مالک ہیں۔ سیدہ امامہ کا ایک واقعہ امام بخاری نے اپنی کتاب کے باب الادب میں روایت کیا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ ایک دن سیدی خیر البشر ﷺ مسجد نبوی میں اس طرح تشریف لائے کہ سیدہ امامہ حضور ﷺ کے کندھوں پر سوار تھی۔ اسے کندھوں پر بٹھائے بٹھائے آپ ﷺ نے نماز پڑھانی شروع کر دی۔ جب آپ ﷺ رکوع کرتے تو اسے نیچے اتار دیتے، جب سجدے سے کھڑے ہوتے تو سیدہ کو دوبارہ کندھے پر سوار کر لیتے۔ اسی طرح آپ نے نماز مکمل کی۔ ذرا تصور کریں کہ سید عالم (میں قربان بہ دل و جان) یہ کیسی نماز ادا کر رہے ہیں! کیا یہ بچی کے ساتھ پیار کی اتھاہ گہرائیوں میں اترا ہوا رویہ نہیں؟ میرے اور آپ کے لیے اس میں کیسا عمدہ نمونہ ہے۔ آیئے اس نمونہ کو اپنانے کا اہتمام کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں، محترم خواتین اسلام مسجد نبوی میں نماز پڑھنے تشریف لایا کرتیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ماؤں کے ساتھ چھوٹے بچے بھی ہوتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرماتے کہ میرا لمبی نماز پڑھانے کو جی چاہ رہا ہوتا ہے پھر میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو (ازراہ شفقت و محبت) نماز مختصر کر دیتا ہوں۔ تاکہ نماز میں شریک ماں اپنے لختِ جگر کو سنبھال سکے۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ نماز میں حضور ﷺ کو ادھر اُدھر کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن بچوں سے شفقت

کا یہ عالم تھا کہ ادھر بچہ رویا اُدھر اللہ کے رسول ﷺ نے نماز مختصر کر دی۔

لمعہ نور 16: شان بندگی

سیدہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ:

آنحضرت محمد ﷺ راتوں کو نماز اتنی دیر قیام کرتے تھے کہ آپ کے پاؤں سوج جاتے۔ورم آجاتا۔ (آخر ایک دن سیدہ عائشہ سے نہ رہا گیا اور انھوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا) آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں حالانکہ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں (عبادت کرکے) اللہ کا شکرگزار بندہ نہ بنوں۔

(بخاری، کتاب التفسیر)

□□□□□□□□

حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ:

نبی اکرم ﷺ میں اتنا طویل قیام فرماتے تھے کہ آپ کے پاؤں پر ورم چڑھ گیا۔اس پر لوگوں نے کہا آپ کے تو اگلے پچھلے سب معاملات درگزر ہو چکے ہیں تو آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں اس کا شکرگزار بندہ نہ بنوں۔

(متفق علیہ)

□□□□□□□□

ان احادیث میں، اگلے پچھلے گناہوں کی جس بخشش کا ذکر ہے، وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے اخذ کیا گیا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے کہ:

”بے شک اے نبی: ہم نے آپ کو کھلی فتح عطا فرمائی ہے۔ تا کہ جو کچھ تیرے گناہ آگے اور پیچھے ہوئے، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، تجھ پر اپنا احسان پورا کرے، اور تجھے سیدھی راہ پر چلائے“۔

□□□□□□□□

اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام کو یہ خیال ہوا کہ اب رسول اللہ ﷺ کو نیکی اور عبادت کے کسی کام کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے مذکورہ بالا سوال کیا تھا۔ نماز بندگی رب کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ یہ شرف آدمیت اور جوہر انسانیت ہے۔ حضرات انبیاء کرام کے ذریعہ ہمیں جو دین عطا کیا گیا، یہ اس میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ خود انبیاء کرام کی عبادت کا معیار بہت بلند ہوتا ہے۔ ان احادیث میں جس طویل قیام کا ذکر ہے۔ یہ حضور ﷺ کی نفل نماز کا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ دیگر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازوں میں حضور ﷺ کا قیام مختصر ہوتا تھا۔ ان میں سید خیر البشر ﷺ اپنے مقتدیوں کا خیال رکھا کرتے تھے۔

آپ کو خیال ہوتا کہ نماز میں کمزور بھی ہوتے ہیں اور توانا بھی، ضعیف بھی ہوتے ہیں اور جوان بھی، بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی، عورتیں بھی ہوتے ہیں اور شیر خوار بچے بھی۔ حضور ﷺ فرماتے کہ میرا لمبی نماز پڑھانے کو جی چاہ رہا ہوتا ہے پھر میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو (ازراہ شفقت و محبت) نماز مختصر کر دیتا ہوں۔ تا کہ نماز میں شریک ماں اپنے لخت جگر کو سنبھال سکے۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ نماز میں حضور ﷺ کو اِدھر اُدھر کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن بچوں سے شفقت

کا یہ عالم تھا کہ ادھر بچہ رویا اُدھر اللہ کے رسول ﷺ نے نماز مختصر کر دی۔

اس لیے یہی معلوم ہوتا ہے ان احادیث میں جن نمازوں کا ذکر ہے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نفل نمازیں ہیں۔ جب آپ ﷺ نفل نماز ادا فرماتے تو قیام رکوع اور سجدے طویل ہوتے۔ بعض اوقات تو رات رات بھر نماز میں مصروف رہتے۔ صرف تھوڑے سے حصے میں استراحت فرماتے۔

ان احادیث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ نمازوں کی کثرت کی ضرورت صرف اس بنا پر ہی نہیں ہوتی کہ گناہ موجود ہوں اور نماز کو گناہ بخشوانے کا ذریعہ بنایا جائے، بلکہ یہ رب کریم کے بے پایاں فضل احسان اور اس کی بے مانگے نعمتوں پر شکر گزاری کی بھی اعلیٰ ترین شکل ہے۔

نماز تقاضائے عبدیت بھی ہے اور تقاضائے شکر گزاری بھی، اس لیے حضور ﷺ نے عبداً شکوراً کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ یعنی ایک شکر گزار بندہ۔ بخشش و کرم کا انعام جتنا زیادہ ہوگا، عبادت کی شان بھی اتنی ہی اونچی ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کی عبادت اپنی کیفیت و کمیت میں تمام معاصرین سے بڑھ کے ہوتی ہے۔ اللہ کریم نے چونکہ رسول اللہ ﷺ کو اس کائنات میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمایا ہے۔ یہ اُس کا تقاضا تھا کہ آپ اپنے مالک کے حضور یوں سر بسجود رہتے جس کا نقشہ ان احادیث میں کھینچا گیا ہے۔ نماز میں یوں مشغولیت وانہماک اسی وجہ سے تھا۔ آپ کے طویل قیام اور طویل تر سجدوں کا مقصد یہی جذبہ شکر گزاری تھا۔ اور واقعتاً یہ ایک مشقت بھرا کام تھا۔ اسی مشقت کے پیش نظر ہی صحابہ کرام نے مذکورہ بالا استغفار فرمایا تھا۔ روایت میں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کے پاؤں مبارک میں ورم آجاتا تھا نہایت قابل توجہ ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ طویل قیام کے باعث پاؤں میں pooling of blood ہو جاتا ہے جس سے پاؤں سوج جاتے ہیں اور قدرے دکھنے بھی لگتے ہیں۔

ایسا کئی گھنٹوں کے کھڑے رہنے سے ہوتا ہے، پس معلوم ہوا کہ پیارے رسول ﷺ اپنے اللہ کے حضور کئی کئی گھنٹے کھڑے رہتے تھے۔

کیا شان بندگی ہے! کیا شان عبودیت ہے!

اتنے طویل قیام میں آپ ﷺ کیا کرتے ہوں گے،

آیئے اگلی حدیث مبارکہ میں اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ہیں۔

□□□□□□□□

حضرت حذیفہ کا بیان ہے کہ:

ایک شب میں نے حضور ﷺ کے ساتھ، آپ کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ آپ ﷺ نے سورہ بقرہ کی تلاوت شروع کی۔ میں نے سوچا ایک صد آیات کی تلاوت کے بعد آپ رکوع کر لیں گے مگر حضور ﷺ بدستور پڑھتے رہے۔ میں نے سوچا شاید سورہ ختم کر کے رکوع فرمالیں گے مگر آپ پڑھتے ہی رہے۔ اب آپ نے سورہ نسا شروع کر دی۔ اُس کو مکمل کیا، پھر آل عمران شروع کر دی اور آپ کی تلاوت ترتیل کے ساتھ تھی، جہاں کوئی آیت تسبیح ہوتی، وہاں آپ ﷺ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی تعریف کرتے۔ جس جگہ اللہ سے مانگنے کا ذکر ہوتا وہاں آپ سوال کرتے، اور جہاں اللہ سے پناہ مانگنے کا ذکر ہوتا وہاں آپ اللہ کے پناہ طلب کرتے۔ یوں تلاوت کے بعد آپ نے رکوع فرمایا۔ رکوع میں آپ ﷺ ''سبحان ابی العظیم'' پڑھتے رہے، پڑھتے رہے، حتیٰ کہ آپ کا رکوع قیام کے برابر ہو چلا پھر آپ نے ''سمع اللہ لمن حمدا'' کہتے ہوئے رکوع سے کھڑے ہو گئے اور قومہ میں کے برابر تک کھڑے رہے۔ پھر آپ سجدہ میں گئے اور ''سبحان ربی الاعلیٰ'' پڑھتے رہے۔ اسے بھی قیام جتنا طویل کیا۔

(مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ المسافرین)

□□□□□□□□

حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ:

میں نے ایک شب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ حضور ﷺ نے بہت طویل قیام کیا یہاں تک کہ میں نے ایک بری بات کے متعلق سوچ لیا۔ راوی نے صحابی سے پوچھا وہ بری بات کیا تھی؟ کہا وہ

یہ تھی کہ آپ بیشک کھڑے رہیں میں بیٹھ جاؤں۔

(مسلم۔کتاب الصلوٰۃ المسافرین)

□□□□□□□□

حضرت عبدالرحمان سے روایت ہے کہ؛

انھوں نے سیدہ عائشہ سے پوچھا: رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی نفل نماز کی کیفیت کیا تھی۔حضرت عائشہ نے کہا؛ رمضان میں یا غیر رمضان میں آپ آٹھ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔اولاً چار رکعت پڑھتے اوران رکعتوں کی طوالت اورخوبصورتی کو نہ پوچھ!

یعنی (خشوع وخضوع کو) پھرآپ تین رکعتیں پڑھتے۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں، میں نے آپ سے عرض کیا کہ کیا آپ وتر پڑھنے کے بعد سو جاتے ہیں،حضور ﷺ نے فرمایا:اے عائشہ میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا''۔

(مسلم۔کتاب الصلوٰۃ المسافرین،ابوداؤد،صلوٰۃ الیل)

یہ طویل قیام، یہ خوبصورت نمازیں!

یہ لمبے لمبے رکوع اور سجدے!!

کس لیے؟؟

یہ ہمارے لیے اسوہ بنا، اپنے اللہ کے حضور سر خم کرنے کا!!

نوافل کا اہتمام کرنا اور انکے ذریعے قرب الٰہی کی تلاش،

یہ ہے ان طویل سجدوں کا پیام!!

شانِ تلاوت، حلاوت ہی حلاوت

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔اس کے لانے والے اور بندوں تک پہنچانے والے اللہ کے رسول سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

سبحان اللہ، ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

ایک کلام اللہ اور دوسرا رسول اللہ!!

حضور ﷺ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، اپنے نوافل میں لمبا لمبا قیام کرتے تھے، اتنا طویل قیام کہ آپ کے پاؤں مبارک میں ورم آجاتا۔اس طویل قیام میں آپ ﷺ کیا کرتے، قرآن ہی پڑھا کرتے۔

قرآن آپ کی چاہتوں کا مرکز، قرآن آپ آرزوؤں کا مرکز،

قرآن آپ کے دل کی دھڑکن،

قرآن آپ کی نمازوں میں، قرآن آپ کی دعاؤں میں،

قرآن آپ کی دعوت کا مرجع، قرآن آپ کی جدوجہد کا مصدر،

دن میں قرآن کی تعلیم، راتوں کو قرآن کی ترتیل،

صبح قرآن، شام قرآن، آپ کی ساری زندگی قرآن تھی۔

□□□□□□□□

اس بات کو سیدہ عائشہ نے اس طرح بیان کیا؛

آپ کا اخلاق تو سراسر قرآن تھا،

قرآن آپ کا اسوہ ہے، قرآن آپ کی سنت ہے۔

اے کاش! قرآن ہی ہمارے لیے راہنما ٹھہرے!!

آپ پر لاکھوں درود، آپ پر کروڑوں سلام،

اور آپ کے قرآن پڑھنے کی شان کیا تھی، ملاحظہ کریں۔

□□□□□□□□

حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ:

حضرت انس سے پوچھا گیا کہ نبی اکرم ﷺ کی قرأت کا طریقہ کیا تھا؟ اس نے جواب میں فرمایا؛ آپ ﷺ الفاظ کو کھینچ کھینچ کر یعنی مد کرتے ہوئے اور پوری طرح پڑھتے ہوئے تلاوت کرتے تھے، پھر انھوں نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر سنائی اور اللہ اور رحیم پر مد کی۔

سیدنا اُم سلمٰی فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ ایک ایک لفظ کو صاف صاف اور الگ الگ کرکے پڑھتے تھے، الحمد اللہ رب العلمین' پڑھ کر کچھ دیر ٹھیرتے، پھر الرحمن الرحیم، پڑھتے، کچھ لمحے توقف فرما کر پھر' مالک یوم الدین' پڑھتے۔ علیٰ ہذا القیاس، یہ آپ کا انداز تلاوت تھا اور مقدار تلاوت کا اندازہ پہلے ہی بیان ہو چکا ہے، یعنی اتنی دیر تک کھڑے کھڑے قرآن پڑھتے کہ پاؤں پر ورم آ جاتا۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اتنی توجہ سے نہیں سنتا جتنی توجہ سے وہ نبی کی بات سنتا ہے جب کہ وہ قرآن خوش آوازی کے ساتھ پڑھ رہا ہو۔

(بخاری و مسلم)

کتنا بڑا محرک اور کتنا بڑا اعزاز ہے نبی اکرم ﷺ کے لیے!!

❑❑❑❑❑❑❑❑

قیام مکہ کے زمانے میں، آپ ﷺ جب اپنی خوبصورت آواز میں تہجد کے وقت بلند آواز میں قرآن پڑھتے تو روایات میں آتا ہے کہ آپ کے سخت ترین دشمن، کفار مکہ، بھی آپ کے مکان کے ارد گرد چھپ چھپ کر اس لے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ امام ابن ہشام نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر اپنی کتاب میں اس قسم کا ایک بڑا ہی حیران کن واقعہ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ؛

نبی اکرم ﷺ کی عادت مبارک یہ تھی کہ آپ راتوں کو اپنے گھر میں قرآن مجید پڑھا کرتے تھے۔

پڑھتے وقت آپ کی آواز قدرے بلند ہوتی تھی، جو رات کی خامشی میں کچھ زیادہ ہی بلند لگتی تھی۔ ایک رات آپ کی اس روح پرور تلاوت کی سماعت کے شوق میں ابوسفیان چھپ کر حضور کے مکان کے باہر آ بیٹھا، ابوجہل بھی اس دلنواز تلاوت کا لطف اٹھانے کے لیے رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی دوسری سمت سے در دولت پر آ بیٹھا، پھر ایک اور مشرک کو بھی یہ شوق چرایا اور وہ بھی دوسروں سے چوری چوری آ گیا۔ یہ اخنس بن شریک تھا۔ یہ تینوں اسلام اور پیغمبر اسلام کے کٹے دشمن تھے۔ لیکن یہ قرآن اور صاحب قرآن کا اعجاز تھا کہ وہ اپنی سماعتوں کے لیے پیغمبر کی شبنمی آواز کی چاہت میں کھچے چلے آئے تھے۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ رات بھر یہ نورانی تلاوت جاری رہی جہاں آپ کے جانثار کیف و مستی میں ڈوبے رہے، وہاں یہ کٹے کافر بھی اس روح افزا تلاوت کا لطف لیتے رہے۔ رات بیت گئی، صبح ہوگئی سب لوگوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ یہ تینوں بھی اپنی اپنی جگہ سے باہر نکلے اتفاق سے یہ تینوں ایک چوک میں اکٹھے ہوگئے اور یوں ایک دوسرے کی چوری پکڑ لی اور ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور آئندہ اس حرکت سے باز رہنے کا عہد کیا۔ لیکن رات آئی تو صبر نہ ہوسکا۔ پہلے کی طرح دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر پھر اپنی اپنی کھڈ میں جا بیٹھے۔ کیف و مستی میں یہ رات بھی ڈوب گئی۔ جب گھروں کو جانے لگے تو پھر وہی اتفاق کہ تینوں اکھٹے ہوگئے، پھر لعن طعن اور عہد و پیماں کیا کہ اس کلام کی ساحری سے توبہ!

لیکن کلام الٰہی بزبان رسول الٰہی، کی دلکشی، دلفریبی ان کو پھر محفل میں کھینچ لائی!

.........وہ کیا سماں ہوتا گا جب رسول اللہ ﷺ قرآن پڑھتے ہوں گے!

.... کیا ساری کائنات وجد میں نہ آتی ہوگی!!

الغرض دنیا پر ثابت ہو رہا تھا کہ یہ لوگ حق کو تو پہچان رہے ہیں لیکن اپنی انا اور قومی غیرت کے باعث اس کو قبول کرنے سے انکاری ہیں۔

□□□□□□□□

سیدنا عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ:

ایک دن حضور ﷺ جب کہ منبر پر تشریف فرما تھے، مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: مجھے قرآن سے پڑھ کر سناؤ۔ میں نے عرض کیا، میں آپ کو پڑھ کر سناؤں حالانکہ آپ ہی پر تو قرآن اترا ہے۔ آپ نے ہاں میں چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے سے قرآن سنوں۔ چنانچہ میں نے سورہ نساء کی تلاوت شروع کی یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا!

”کیا بنے گی اُن لوگوں پر اس وقت، جب کہ ہم ہر امت پر ایک گواہ لائیں گے اور اے نبی! ہم آپ کو اس امت پر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے“۔

(القرآن۔ سورہ نسا)

تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بس کافی ہے، اچانک میری نگاہ رسول اللہ ﷺ پر گئی تو میں نے جانا کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

□□□□□□□□

آپ ﷺ کا یہ رونا احساس ذمہ داری کا نتیجہ تھا۔ جو ڈیوٹی اللہ نے اپنے رسول کے سپرد کی تھی اس کے لیے فکرمندی کا رونا تھا۔ یہ گریہ عظمت قرآن کے باعث تھا۔ کلام الٰہی کے جلال و جمال کے باعث تھا۔ بہت سی روایات میں یہ چیز نقل ہوئی ہے۔

ہماری کیا ذمہ داری ہے؟

یہ قرآن اللہ کے رسول کی امانت ہے ہمارے پاس، اس کی تلاوت کے درمیان میں کبھی ہماری آنکھیں بھی تر ہوں تو سوا د آئے۔

اے کاش! ہم اللہ کے کلام کو سمجھ سکیں۔

یا اللہ کریم: ہمیں بھی قلب خاشع عطا فرما جو تیری یاد میں تڑپنا جانے،

اور وہ چشم عطا کر جو تیرے کلام کو پڑھتے وقت برسنا جانیں۔ آمین

سیدنا عوف بن مالک کہتے ہیں:

میں ایک شب رسول کریم کے ساتھ تھا۔آپ ﷺ نے مسواک کی۔

پھر وضو فرمایا اور نماز کی نیت باندھ لی۔

میں نے رسول اللہ ﷺ کا اقتداء کیا اور حضور کے ساتھ ہی نماز کی نیت باندھ لی۔

آپ نے سورہ بقرہ کی تلاوت شروع کردی۔

یہ تلاوت اس شان کی تھی کہ جب کبھی رحمت کی آیت آتی،آپ اس پر رکتے اور اللہ کی رحمت طلب فرماتے،اسی طرح جب کوئی عذاب والی آیت آتی،تو اس توقف فرماتے اور رب تعالیٰ سے پناہ طلب فرماتے"۔

(شمائل ترمذی)

❑❑❑❑❑❑❑❑

اُم المومنین سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ:

ایک رات رسول اللہ ﷺ تہجد کی نماز میں ایک ہی آیت کی تکرار فرماتے رہے۔

سورہ مائدہ میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ O

(سورہ المائدہ۔۱۱۸)

ترجمہ؛

"اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف فرمادے تو تُو زبردست حکمت والا ہے"۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ساری رات اپنے رب سے کس بات کا تکرار رہا ہوگا۔اس آیت میں ایک طرف تو اللہ کے سامنے بندوں کی عاجزی اور بے بسی کا اظہار ہے،دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت اور اس کے قادر مطلق اور مختار کل ہونے کا بھی بیان ہے۔پھر ان دونوں باتوں کے حوالے

سے عفوو مغفرت کی التجا بھی۔

سبحان اللہ! کیسی عجیب و بلیغ آیت ہے۔تبھی تو محسن انسانیت صرف اسی ایک آیت کو ساری رات دہراتے رہے تھے۔

(مسند احمد،شمائل ترمذی)

□□□□□□□□

امام بیہقی نے اپنی کتاب میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک دن سیدنا ابوبکر نے عرض کی ؛ یارسول اللہﷺ میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہو رہے ہیں،فرمایا؛ مجھے سورہ ہود،واقعہ اور مرسلات جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔

(سیرۃ النبی از ابن کثیر،جلد سوم۔ص ۳۶۲)

□□□□□□□□

شانِ استغفار

سیدنا ابوہریرہ کا بیان ہے کہ:

رسول اللہﷺ نے فرمایا: بخدا میں ایک دن میں ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرتا ہوں آپﷺ نے مزید فرمایا کہ اپنے اللہ کی طرف رجوع کرو،اس کے سامنے توبہ کیا کرو کیونکہ میں خود بھی دن میں سو بار اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔

(بخاری،مسلم)

استغفار و استکبار دو لفظ ہیں،دو رویے ہیں اور مختلف طرز زندگی ہیں۔

استغفار،شان بندگی ہے،استغفار،شرف آدمیت ہے اور استغفار سنت نبوی ہے۔

استغفار کیا ہے؟

اپنے رب کے حضور اعتراف وتسلیم کا نام،

اپنے اللہ کے حضور عجز و نیاز کے ساتھ ہاتھ پھیلا دینے کا نام ہے،

اپنے دل ودماغ کو اللہ کے حضور لوٹانے کا نام استغفار ہے،

اور استکبار کیا ہے، اللہ کی پناہ اس راہ سے، یہ تو شیطان کی راہ ہے۔

یہ ابلیس لعین کی پسند ہے۔ غرور و تکبر کا نام ہے۔

ہم اپنے جولیوں کو اپنے سے کم تر سمجھنا اور ان سے کمتری کا رویہ اپنانا، استکبار ہے،

استغفار سے رب کی رضا ملتی ہے اور استکبار سے اس کے دربار سے دھتکار ملتی ہے،

استغفار جناب سیدنا آدم نے کیا تھا اور استکبار کی راہ شیطان مردود نے اختیار کی تھی۔

محسن انسانیت ﷺ نے اپنے باوا آدم کی راہ اختیار فرمائی اور یہی نقش ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

سید عالم ﷺ سب سے زیادہ اللہ سے پیار کرنے والے، اس کے حضور جھکنے والے اور اسی کے آگے دست سوال دراز کرنے والے تھے۔ ستر ستر بار یا سو سو بار سے مراد کثرت ہے نہ کہ کوئی گنتی پورا کرنا ہے۔ اور یہ صرف زبان سے چند الفاظ کہہ دینے کا نام بھی نہیں ہے بلکہ یہ ایک رویے اور طرز زندگی کا نام ہے۔ زبان پر توبہ استغفار اور عمل میں اللہ کی نافرمانی اور اس پر اکڑنا ہو تو ایسے استغفار کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

سرورِ عالم ﷺ کا سفر جاری ہے۔ کسی مہم سے واپسی ہے یا کسی مہم پہ روانگی ہے۔ حدیث مبارک سے اس بات کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ آنحضور ﷺ اونٹنی پر سوار ہیں۔ صحابہ کرام آپ کے آگے پیچھے رواں دواں ہیں۔ کوئی پیدل ہے تو کوئی سواری پر، کیا خوش نصیب تھے وہ لوگ جو قائد انسانیت ﷺ کے ہمسفر رہا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ پر دل و جان سے فدا تھے۔ اچانک ایک دیہاتی جھاڑیوں سے نکلتا ہے اور آپ ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ رک جاتے ہیں تو سارا قافلہ ہی رک جاتا ہے۔ قافلے کے کچھ لوگ اس آدمی کے ارد گرد آ کھڑے ہوتے ہیں مبادا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ وہ دیہاتی حضور پاک ﷺ (فداامی وابی) سے عرض کرتا ہے یا رسول اللہ ﷺ یا شاید اس نے اے محمد (ﷺ) کہا ہو: مجھے ایسے اعمال بتایئے جس سے میں جنت کے قریب ہو سکوں۔ یعنی جن اعمال کے کرنے سے مجھے جنت مل جائے اور آگ یعنی جہنم کی آگ سے دور ہو جاؤں؟

کیا حسن طلب ہے!

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں ہمیں آپ ﷺ سے زیادہ سوال کرنے کی ممانعت تھی، اس لیے

ہماری خواہش یہ ہوتی کہ کوئی سیانا اور بے باک دیہاتی آئے اور آپ ﷺ سے دین کے بارے میں سوال پوچھے تا کہ ہم بھی سن لیں۔ سوال کرنے کی ممانعت شاید اس وجہ سے ہوگی، چونکہ مدینہ طیبہ کے لوگ ہر وقت آپ کے آس پاس موجود ہوتے تھے اور آپ ﷺ کو دیکھتے اور سنتے رہتے تھے اس لیے انھیں ایک تو سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی ہوگی، دوسرے یہ شاید اس لیے بھی ہو کہ ہر وقت سوال کرتے رہنے سے حضور ﷺ کو پریشانی لاحق نہ ہوتی رہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دین سیکھنے کے جذبے سے کوئی مشکل درپیش ہو تو یقیناً در انسانیت اور معلم انسانیت کے حضور حاضری کے علاوہ اور تو کوئی جگہ نہ تھی۔ بہر حال صحابہ کرام کی احتیاط اور ادب اور حسن طلب کے درمیان مقابلہ رہتا ہوگا ایسے میں کوئی اجنبی آ کر حضور ﷺ سے بے باکانہ سوال کرتا، جیسا کہ اس واقعے میں ہمیں نظر آیا ہے تو یقیناً مدینے کے صحابہ کہیں زیادہ متوجہ ہوتے ہوں گے!!

دین سیکھنے کا یہ وہ جذبہ ہے جو صحابہ کرام کو آپ کے حضور ہر وقت حاضر رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ فی حقیقت قیامت تک کے لیے انسانوں پر صحابہ کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے اس حسن طلب سے دین سیکھا، اسے محفوظ رکھا اور آنے والی نسلوں تک اسے منتقل کیا۔

دوران سفر اعرابی کے اس طرز عمل پر رسول اللہ ﷺ ناراض نہیں ہوئے بلکہ سراپا متوجہ ہوئے اور اپنے صحابہ کو بھی متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: دیکھو اس کو کیسی عمدہ توفیق ملی ہے۔ یعنی کیسا خوبصورت اور عمدہ سوال کیا ہے اس شخص نے!!

آپ ﷺ نے اس اعرابی سے کہا؛ اپنا سوال ایک مرتبہ دہراؤ۔

کیا انداز تعلیم ہے اس معلم انسانیت کا!

آپ ﷺ سفر میں، حضر میں اپنے صحابہ کی تعلیم و تربیت کا کس طرح اہتمام رکھتے تھے اس واقعہ سے بخوبی ظاہر ہو رہا ہے۔ کسی اہم بات کو دو تین بار دہرانا آپ ﷺ کا معمول تھا تا کہ بات صحیح طرح سے سامعین کے ذہن نشین ہو جائے۔ یہاں بھی اعرابی کو جو سوال دہرانے کا حکم دیا یہ بھی اس کے سوال کی اہمیت کی بنا پر تھا، تا کہ تمام صحابہ اس کو سن لیں، اس اعرابی اپنا سوال دہرایا؛ اور عرض کی مجھے آگاہ کیجئے اے محمد ﷺ اس بات سے جو مجھے جنت کے قریب اور آتش دوزخ سے دور کر دے"۔

اخبرنی بما یقربنی من الجنۃ و یبا عدنی من النار

حضرت ابوایوب فرماتے ہیں:

حضورﷺ نے فرمایا: **تعبد اللہ و لا شرک بہٖ شیاً**

''اللہ کی عبادت کرتے رہو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت بناؤ''۔

و تقیمو الصلوٰۃ

اور نماز قائم کرتے رہو

و توتی الزکوٰۃ

اور زکواۃ ادا کرتے رہو'' (یہاں زکواۃ سے مراد صدقہ ہے۔ زکواۃ کا حکم اس کی کم از کم مقدار کا تعین ہے اصحاب ثروت کے لیے)۔

اس کے بعد رسول اللہﷺ نے فرمایا؛ **و تصل الرحم**؛

اور صلہ رحمی کرو''۔ (یعنی اپنے قرابت داروں کے ساتھ حسب مراتب اچھا سلوک کرو اور انکے حقوق ادا کرو)۔

پھر محسن انسانیت نے اس نا آشنا بدو سے مسکراتے ہوئے فرمایا: اب تو میری اونٹنی کی مہار چھوڑ دے یعنی اب ہمیں جانے دو، جب وہ شخص چلا گیا تو آپ نے صحابہ سے فرمایا: اگر یہ مضبوطی سے ان باتوں پر عمل کرتا رہا تو یقیناً جنت میں جائے گا۔

(معارف الحدیث، جلد اول ص ۷۹، بحوالہ مسلم شریف)

حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ میری امت میں سب سے زیادہ نرم دل، مہربان طبیعت ابوبکرؓ ہیں۔ احکام الٰہی کی پابندی کروانے میں سب سے زیادہ سخت اور پختہ عمرؓ ہیں۔ حیا میں سب سے بڑھ کر عثمانؓ، فعل خصومات میں سب سے بہتر علیؓ، حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم معاذ بن جبلؓ، علم فرائض کے سب سے زیادہ واقف زید بن ثابتؓ، علم قرأت کے سب سے بڑے ماہر ابی بن کعبؓ، اور ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس امت کے امین ابوعبیدہ بن جراحؓ ہیں۔ اور ابوذرؓ سے زیادہ حق گو نہ زمین نے دیکھا اور نہ فلک نیلگوں ایسے انسان پر سایہ فگن ہوسکا۔ پرہیز گاری میں ابوذرؓ نمونہ مسیح ہیں۔

عرب میں ڈکیتیاں عام تھیں۔ مال واسباب لوٹنے کے علاوہ، بچوں بڑوں اور عورتوں کو بھی ڈاکو اٹھا لے جاتے تھے۔ اگرچہ گھر بھی محفوظ نہ تھے،لیکن عموماً ڈاکوؤں کا شکار تجارتی قافلے ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ قافلوں میں مال واسباب بھی بہت ہوتا تھا اور شہری آبادی سے دور ہونے کے باعث ڈاکوؤں کے لیے ان کا شکار بھی آسان ہوتا تھا۔ دین اسلام کی آمد، پھیلاؤ اور مقتدر ہو جانے کے بعد عرب کے شہر اور راستے ڈاکوؤں سے پاک ہو گئے۔ راہزن، رہبر بن گئے اور چشم فلک نے وہ نظارہ بھی دیکھا کہ صفا سے حضر موت تک اکیلی عورت سونا اچھالتی گزرتی چلی گئی اور اس کی عزت وعصمت اور اس کے سیم وزر کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہ قبل از بعثت محمدی کا واقعہ ہے۔ مکے سے دور ایک قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ قافلے میں مال واسباب بھی بہت تھا اور عورتیں اور بچے بھی ساتھ تھے۔ قبیلہ قلب کے حارث بن شرجیل کی بیوی سعدیٰ بنت ثعلبہ جو قبیلہ بن طے کی شاخ بنو ثعلبہ سے تھی وہ اپنے آٹھ سالہ بچے زید کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ اچانک راہزنوں نے قافلے پر حملہ کر دیا، ہنگامہ برپا ہو گیا، مال واسباب لوٹا جانے لگا۔ محافظین قافلہ نے دفاع وتحفظ میں جانیں لڑا دیں لیکن ڈاکو اپنے

مقصد میں کامیاب رہے۔لوٹ مار اور دنگا فساد مچا کر ڈاکو جب بھاگ جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اُم زید کی تو ممتا بھی لٹ چکی ہے۔ڈاکو جاتے ہوئے ان کے آٹھ سالہ لختِ جگر زید کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔زید کی ماں پر تو چند لمحوں میں قیامت بیت گئی۔اس کی آہ و بکا آسمانوں کا دل ہلا رہی تھی۔قافلے والے بے بس تھے۔سوائے صبر کے وہ اس خالی گود ممتا کو کیا تسلی دے سکتے تھے۔یہ لٹا پٹا قافلہ جب اپنے وطن پہنچا تو حارث اپنی بیوی کو خالی ہاتھ دیکھ کر حواس کھو بیٹھا۔اس کی دنیا اجڑ چکی تھی۔وہ اپنے بیٹے کی تلاش میں سرگرداں رہا۔سیدنا یعقوب کی مانند اس کا چمن بھی اجڑ چکا تھا۔اب آنسو تھے اور وہ تھا۔اب صحرا کی تپتی ریت تھی اور بیٹے کی تلاش میں صحرا نوردی۔روایات میں آتا ہے کہ حارث ایک طویل عرصہ صحراؤں میں اپنے بیٹے کو کھوجا کیا۔اپنے لال کی تلاش میں اس نے عرب کا چپہ چپہ چھان مارا۔لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔یہ بدفطرت ڈاکو جو بنی قیس بن حاشر کے آدمی تھے۔عکاظ کے بازار میں پہنچے۔مال و متاع کے ساتھ ساتھ اغوا کئے گئے بچے بھی منڈی میں لے آئے تھے۔کیا بدقسمت زمانہ تھا جس میں انسانوں کی منڈیاں سجتی تھیں۔انسان بیچنے والا،انسان ہی بکنے والا اور انسان ہی خریدنے والا۔انسان درندہ بنا ہوا تھا۔بلکہ درندوں سے بھی بدتر۔بے بس کمزور انسان دبا لیے گئے تھے۔عکاظ کے میلے میں بھی انسان برائے فروخت کا لیبل لیے موجود تھے۔معصوم بچے،چہروں پر افسردگی اور یاس سجائے گاہکوں کے انتظار میں تھے۔انہی میں حارث کا بیٹا زید بھی تھا۔خریدار ٹٹول ٹٹول کر بھاؤ لگا رہے تھے۔

انھی خریداروں میں حکیم بن حزام بھی تھا۔اس کو زید پسند آ گیا۔مول تول کر کے وہ اسے خرید لیتے ہیں اور غلام بنا کر اپنے گھر لے آتے ہیں۔حکیم بن حزام اس غلام کو اپنی پھوپھی جنابہ خدیجہ طاہرہ کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کرتے ہیں۔خدیجۃ الکبریٰ بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہیں۔اسے بھینچ کر پیار کرتی ہیں۔بچے کو اپنی ماں یاد آ جاتی ہے اور اس کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔جنابہ طاہرہ بچے پر ممتا نچھاور کرتے ہوئے کہتی ہیں۔بیٹے،پیارے بیٹے آج سے یہ تمہارا گھر ہے۔ہنسی خوشی رہو یہاں حارث اور ہند بھی موجود ہیں ان کے ساتھ مل کے کھیلو۔

آج کا یہ روتا ہوا بچہ زید اور اسے تھپکیاں دیتی خدیجہ طاہرہ،کیا جانیں کہ ان دونوں کے مقدر میں

رحمت، شفقت اور برکت وسعادت کا وہ نور لکھا جا چکا ہے کہ جس کی معیت پر کائنات فخر کرتی ہے، زید کو کیا خبر کہ قدرت اس پر کتنی مہربان ہو چکی ہے اور یہ غلامی اس کے لیے راحت ورحمت کا وہ دروازہ کھولنے والی ہے جس پہ لاکھوں آزادیاں قربان۔

زید کو خدیجہ گھر لے آتی ہیں۔ابھی سال ہی ہوا ہے کہ خدیجہ کا عقد کائنات کے حسین ترین اور عمدہ ترین نوجوان سے ہو جاتا ہے۔وہ محمد بن عبداللہ (ﷺ) کی دلہن بنی ارض وسماء سے مبارک بادیاں لے رہی ہیں۔زمین سے برکت ونور کے چشمے ابل پڑے ہیں۔کائنات میں حسن وجمال وسرور کی پھلجڑیاں چلائی جا رہی ہیں اور چاروں طرف قوس وقزح کے رنگ پھیل گئے ہیں۔یہ لاوارث غلام زید بن حارث کلابی اب محمد عربی (ﷺ) کی غلامی میں اور سایہ شفقت وعاطفت میں آ گیا ہے۔یہ پھول بچہ بھول چکا ہے کہ وہ کسی اجنبی ماحول میں ہے۔رحمت عالم کے سینہ میں زید کے لیے ایسی شفقت ہے جس نے اس کی اداس زندگی میں مٹھاس گھول دی ہے۔جناب محمد ابن عبداللہ (ﷺ) کی صورت میں اسے باپ کا پیار بھی ملا ہے اور ماں کی ممتا بھی۔

واہ سے زید تیری حسین قسمت، مقدر نے تجھے کس کے قدموں میں لا ڈالا ہے!

تجھے کیا خبر تو کس کی خدمت کر رہا ہے!

دیکھ، ذرا دیکھ، یہ تو نے کس کے ہاتھ دھلوائے ہیں،

کس کو وضو کرایا ہے، ذرا نیچے گرتے ہوئے پانی کو تو دیکھ۔جسے فرشتے اپنے چہروں پر مل رہے ہیں۔

زید بڑا ہو رہا ہے۔سیانا ہو رہا ہے۔توانا ہو رہا ہے۔ان پہ رات، رات پہ دن گزرتے جاتے ہیں۔ محمد ﷺ کی غلامی میں رہتے انھیں آٹھ سال گزر گئے۔بچپن ختم ہوا اور وہ جوانی کی دہلیز تک آ پہنچے۔ اسے اب ماں باپ بھول چکے تھے۔اب وہ محمد ﷺ کو اپنا باپ اور سیدہ خدیجہ کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ جیسا کہ مکہ مکرمہ آج ایک بین الاقوامی شہر ہے اُس وقت بھی یہ ایک بین الاقوامی شہر ہی تھا۔ایک دن زید مکہ کی گلیوں میں گھوم رہے تھے کہ ایک آدمی نے اسے پکڑ لیا اور پوچھا: اے نوجوان کیا تو زید بن حارثہ کلابی نہیں۔یہ آدمی قبیلہ بنو قلب سے تھا۔اپنے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ حج کرنے آیا تھا۔اُس نے راہ جاتے زید کو پہچان لیا تھا۔زید نے بھی اپنے قبیلے کے اس آدمی کو پہچان لیا تھا انھوں نے کہا

ہاں میں زید بن حارثہ کلابی ہی ہوں۔فوراً بتایئے میرے ماں باپ کیسے ہیں۔

اس آدمی نے زید کو گلے لگاتے ہوئے کہا: تیرے بعد تیری ماں اندھی اور تیرا باپ تیری تلاش میں دیوانہ ہو گیا تھا۔اب تم ہمارے ساتھ چلو۔زید کا بڑا دل چاہا کہ وہ ان کے ساتھ چلا جائے مگر کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔یہ قافلہ جب اپنے وطن پہنچا تو انھوں نے زید کے والدین کو اس امر سے آگاہ کیا کہ اُن کا بیٹا مکہ میں ہے۔اُن کی تو گویا عیدیں ہو گئیں۔

حارث نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مکہ روانہ ہوئے۔کافی رقم بھی ساتھ لے لی اور تحائف بھی ساتھ لے لیے۔بغیر کوئی آرام کیے دونوں بھائی چلتے رہے کہ مبادا زید کہیں آگے نہ بیچ دیا جائے۔سوسو سوسے ان کے ذہن میں آتے تھے کہ پتا نہیں وہ کیسے لوگ ہیں۔وہ ہمیں ہمارا نورِ نظر واپس بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ معلوم نہیں وہ کتنے پیسے مانگیں گے۔وغیرہ وغیرہ

پھر وہ مکہ پہنچ گئے۔پہلے خانہ کعبہ کا طواف کیا۔پھر لوگوں سے محمد بن عبداللہ (ﷺ) کے متعلق دریافت کیا۔حسن اتفاق سے حضورﷺ بھی اس وقت حرم میں ہی تھے چنانچہ اُن سے ملاقات ہو گئی دونوں بھائیوں نے انھیں اپنے مدعا سے آگاہ کیا۔رحمت عالمﷺ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا: آپ کا بیٹا ہمارے پاس امانت ہے ہم اسے ابھی بلاتے ہیں۔اگر وہ آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہو تو ہماری طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔یہ سن کر کلابیوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ان کا گوہر مقصود اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ آنے والا ہے۔آپﷺ نے کسی بھیجا کہ وہ زید کو بلا لائے۔زید آئے اور انھوں نے دور سے ہی اپنے باپ کو پہچان لیا اور اُن کے گلے لگ گئے۔باپ کے بعد وہ اپنے چچا سے ملے۔باپ بیٹے کی یہ ملاقات کیا منظر ہو گا۔جدائی کے یہ دس سال حارث نے کس طرح کاٹے ہوں گے اور زید نے کس ضبط سے کام لیا ہو گا۔صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔

جب سب سکون سے بیٹھ گئے تو آنحضورﷺ نے زید سے پوچھا: زید ان کو پہچانتے ہو۔زید نے کہا یہ میرے باپ ہیں اور یہ میرے چچا ہیں۔

تب آپﷺ نے فرمایا: یہ تمھیں لینے آئے ہیں اگر تم ان کے ساتھ جانا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض

نہیں آج سے تم آزاد ہو۔ باپ نے آس اور امید دیئے جلائے اور کہا:

ہاں بیٹا؛ چلو ہمارے ساتھ چلو؛ اب تم آزاد ہو۔

وہاں تمھاری ماں اور بہنیں ایڑیاں اٹھا اٹھا کر تمہاری راہ تک رہی ہیں۔

حضرت زید چند لمحے توقف کیا پھر کہا:

نہیں ابو جی نہیں۔ اب میں دامن مصطفیٰ کو نہیں چھوڑ سکتا۔

یہ سنتے ہی حارث کی چیخیں نکل گئیں۔

چشم فلک نے یہ کیا نظارہ دیکھا کہ ایک آدمی بقائمی ہوش حواس غلامی کو آزادی پر ترجیح دے رہا ہے۔

اپنے گھر پر غیر کے گھر کو ترجیح دے رہا ہے۔

ہاں، ہاں یہ سچ ہے آزادی کو غلامی پر لٹایا جا رہا ہے۔ آج یہ واقعہ ہو رہا ہے۔

کہا: ابو جان۔ یہ دروازہ نہیں چھوڑ سکتا۔

جو لطف محمد (ﷺ) کی غلامی میں وہ کہیں اور نہیں مل سکتا۔

اتنے میں حارث بھی جان گیا تھا کہ اُس کا بیٹا جو فیصلہ کر رہا ہے اسی میں اس کی بہتری ہے۔

وہ اسے پیار دے کر چلا جاتا ہے۔

جناب محمد ﷺ اس وقت حجر اسود کے قریب آ کر لوگوں سے کہتے ہیں لوگو سن لو زید آج سے آزاد ہے اب یہ میرا غلام نہیں بلکہ میرا بیٹا ہے۔ اب یہ زید بن محمد ہے (ﷺ)۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ:

میں دس سال تک رسول اللہ ﷺ کا ذاتی ملازم رہا۔ بچپن میں آپ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کے وصال مبارک تک آپ ﷺ کی خدمت کی سعادت حاصل کی۔ کسی ایک دن بھی آپ ﷺ نے نہ تو مجھے جھڑکا اور نہ ہی کبھی یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا۔ یا وہ کام کیوں نہیں کیا۔ گھر کے نوکروں اور خادموں کے ساتھ حسن سلوک، نرمی اور شفقت، یہ ہے آپ کا اسوہ حسنہ!!

اے نوکروں سے محبت کرنے والے رسول

آپ پر لاکھوں درود آپ پر کروڑوں سلام

خوش خلقی

سیدی رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں دو صحابی خواتین کا ذکر بخاری کی روایت میں آیا ہے۔ ان میں سے ایک رات بھر نوافل ادا کرتیں، دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں۔ مگر وہ بڑی زبان دراز تھیں اور اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا ناک میں دم کیے رکھتی۔ دوسری خاتون محترم صرف فرض نماز پڑھتی، اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں۔ مگر زبان کی میٹھی تھیں اور کسی کو تکلیف دینے والی نہ تھیں۔ آنحضور ﷺ سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپ نے اول الذکر عورت کے بارے میں فرمایا؛ کہ اس میں کوئی نیکی نہیں اور وہ اپنی بد خلقی کی سزا بھگتے گی۔ دوسری خاتون کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا؛ وہ جنتی ہے۔ ان دونوں عورتوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے ہادی برحق ﷺ کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اسلام میں اخلاق کی اہمیت و حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

لمعہ نور:19 بہن پیاری بہن

فتح مکہ (رمضان ۸ ہجری کے بعد) مکہ مکرمہ کے باہر عرب قبائل نے اتحاد کر کے فاتح مکہ سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔قریش مکہ کے بغیر لڑے یوں سرنگوں ہو جانے پر ان قبائل میں شدید ردعمل پیدا ہو چکا تھا۔ان میں بنو ہوازن، بنو ثقیف، بنو نضر اور بنو جشم وغیرہ شامل تھے۔یہ قبائل خوشحال، سرسبز و شاداب وادیوں کے مکین، بڑے جنگجو اور فنون حرب سے آشنا تھے۔حنین کے میدان میں پھر اوطاس کے میدان میں ان قبائل سے مقابلہ ہوا۔جس کے نتیجے میں ان قبائل کو شکست ہوئی اور ان کے کم و بیش چھ ہزار افراد جن میں عورتیں بچے اور مرد شامل تھے، گرفتار ہوئے۔اور بے پناہ زر و جواہر اور ہزاروں کی تعداد میں مول مویشی بطور غنیمت ہاتھ لگے۔ان متحارب لوگوں کو شکست کے بعد جب مسلمان گرفتار کر کے لا رہے تھے تو ایک خاتون نے کہا؛ ذرا نرمی سے کام لیجئے۔واللہ میں تمھارے نبی کی بہن ہوں۔

آنحضور ﷺ اپنے والدین کرام کی اکلوتی اولاد ہیں۔آپ کا نہ تو کوئی بھائی تھا اور نہ ہی کوئی بہن۔ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت سے قبل ہی آپ کے والد محترم جناب عبداللہ بن عبدالمطلب وفات

پا چکے تھے۔ پیدائش کے بعد آپ کو مکہ کے مفاضات میں قبیلہ بنو سعد بن بکر میں دودھ پلانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ سعادت بی بی حلیمہ سعدیہ کے حصے میں آئی۔ دائی حلیمہ کے خاوند کا نام حارث بن عبدالعزیٰ تھا۔ انیسہ بنت حارث اور شیما بنت حارث آپ کی رضاعی بہنیں اور عبداللہ بن حارث آپ کا رضاعی بھائی تھا۔ دو سالہ مختصر رضاعت کے بعد بی بی حلیمہ سعدیہ آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ واپس لے آئیں۔ تو دل میں یہ خواہش تھی کہ یہ متبرک اور نیک بچہ چند برس مزید ہمارے ساتھ رہے تو کیا ہی خوب ہو۔ کیونکہ آپ کے قیام کے دوران وہ بے پناہ فیوض و برکات سے مستفید ہو چکی تھیں۔ آپ کی پیاری پیاری حرکات وسکنات دل موہ لینے والی شگفتہ باتیں اور شائستہ عادات وخصائل کے باعث وہ آپ کو خود سے جدا نہ کرنا چاہتی تھیں۔ آپ کی رضاعی بہنیں خصوصاً شیما بنت حارث نہایت دل گرفتہ اور اداس تھی۔ بی بی حلیمہ سعدیہ نے حضور پاک ﷺ کی امی جان سے بہت اصرار کر کے آپ کو واپس لے جانے پر راضی کر ہی لیا۔ اور یوں آپ ﷺ مزید تین سال اس خاندان میں پرورش پاتے رہے۔ حارث کی بیٹی شیما عمر میں آپ سے بڑی تھی۔ اسے اپنے اس ہاشمی بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ مل کر ان کی پرورش میں بھر پور تعاون کرتی تھی۔ آپ ﷺ اٹھا کر بستی کے دیگر گھروں میں لے جاتی۔ کھیتوں اور میدانوں میں لے جاتی۔

بکریاں چرانے میں سب بہن بھائی آپ ﷺ کو ساتھ لے جاتے۔ کبھی گلی محلّہ میں، کبھی بازار میں کبھی اڑوس پڑوس میں شیما آپ کو ساتھ ہی اٹھائے رکھتی۔ وہ آپ کے کپڑے دھوتی، آپ کو نہلاتی اور اپنے ساتھ ہی سلاتی۔ غرض وہ مکمل طور پر آپ کی پرورش میں اپنی ماں کے ساتھ شریک رہی۔ اور آج یہی شیما بنت حارث ایک قیدی کی صورت میں اپنے بھائی کے پاس لائی جا رہی تھی۔ وقت کے پلوں سے بے شمار پانی بہہ چکا تھا۔ آمنہ کا وہ دریتیم اور شیما کا وہ لاڈلا ہاشمی بھائی جو کبھی ان کے غربت کدوں میں کھیلتا کودتا تھا۔ اب اللہ کا رسول اور سلطنت عرب کا بادشاہ بن چکا تھا۔ فاتح بدر و حنین مقام جعرانہ میں مقیم تھے جب آپ ﷺ کی مجلس میں لوگ اس خاتون کو لائے جس کو آپ کی بہن ہونے کا دعویٰ تھا۔

انھوں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ یہ خاتون کہتی ہے کہ وہ آپ کی بہن ہے۔ آپ ﷺ کھڑے ہو گئے

اس وقت آپ ﷺ کی عمر ساٹھ سال ہو چکی تھی۔ وہ ستر سالہ بڑھیا آپ کے سامنے تھی۔ آپ ﷺ کی آنکھوں کے آگے آپ کا بچپن اور اس کی سہانی یادیں آ گئیں۔ فرمایا اگر تم شیما ہو تو پھر تمھارے کندھے پر ایک نشان ہو گا۔ اس نے اپنا کندھے سے قمیض ہٹائی اور نشان دکھا کر کہا؛ ہاں اللہ کے رسول بچپن میں آپ نے مجھے یہاں کاٹا تھا۔

اس جذباتی ماحول میں آپ ﷺ کی اور جملہ حاضرین کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ آپ ﷺ نے اپنی چادر مبارک جس کی قسمیں میرا رب اپنے عرش پر بیٹھا کھاتا ہے، فرش پر بچھا دی اور نہایت عزت و احترام سے اپنی پیاری بہن کو اس پر بٹھایا۔ خود اس کے پاس بیٹھ گئے۔ دودھ میں شرکت کے رشتے کو اللہ اور اس کے رسول نے بے پناہ شرف و عزت بخشی ہے۔ جب رضاعی بہن کا اتنا اکرام ہے تو اصل بہن کا کتنا اکرام ہو گا ہمارے دین میں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ عورت کو جو شرف و عزت اسلام میں حاصل ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کا عشر عشیر بھی دیگر اقوام و مذہب میں نہیں ہے۔ بہن قدرت خداوندی کا وہ انمول تحفہ ہے جو وفا و محبت اور خلوص و ایثار و قربانی کا مجسمہ ہے۔ بھائیوں کے لیے بہنیں عزت و وقار کی علامت ہوتی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے طرزِ عمل سے یہی سمجھایا ہے کہ بہنیں عزت و اکرام اور داد و پیش کا رشتہ ہیں۔ سکون سے بیٹھ جانے کے بعد آپ ﷺ نے اپنی بہن سے فرمایا: چاہو تو میرے پاس تعظیم و تکریم سے رہو۔ جو مانگو ملے گا، سفارش کرو قبول کی جائے گی دل چاہے تو میرے پاس رہو، دل چاہے تو میں تمہیں تحائف دیتا ہوں اور تم اپنی قوم کے واپس واپس چلی جاؤ۔ اس نے عرض کیا؛ آپ مجھے کچھ دیں اور قوم کے پاس واپس بھیج دیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو تحائف دے کر ان کے قبیلے میں واپس بھیج دیا۔

اے رشتوں کو تقدس دینے والے نبی تجھ پر لاکھوں درود، تجھ پہ کروڑوں سلام

GENETICS

سیدنا ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ ایک دیہاتی عرب آنحضورﷺ کے پاس آیا اور عرض کی کہ میرے بیوی نے ایک کالے بچے کو جنم دیا ہے، (جس کا رنگ اور شکل و شباہت مجھ سے نہیں ملتی) میں اس بچے کو اپنا نہیں سمجھتا۔ رسول اللہﷺ نے اس سے پوچھا؛ تیرے پاس اونٹ ہیں۔ وہ بولا ہاں ہیں۔ آپ نے پوچھا ان کا رنگ کیا ہے۔ اُس نے کہا؛ سرخ ہے۔ آپ نے پوچھا کیا ان میں کوئی خاکستری رنگ کا بھی ہے۔ دیہاتی بولا، جی ہے۔ ایسا بھی ہے۔ آپﷺ نے استفسار فرمایا؛ پھر یہ کیسے آگیا۔ (جبکہ اس کے ماں باپ تو سرخ رنگ کے تھے)۔ اُس نے کہا؛ اوپر کے باپ دادا میں سے کسی رگ نے یہ رنگ کھینچ لیا ہوگا۔ آپﷺ نے فرمایا؛ بس یہی بات ہے تیرے بچے کا رنگ بھی اوپر کے کسی آباء سے کسی رگ نے کھینچ لیا ہوگا۔ اس طرح آپﷺ نے اس کو یہ اجازت نہ دی کہ اس بچہ کی نسبت وہ یوں کہے کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے۔

(بخاری۔ کتاب الاعتصام)

آج بھی مکہ بے آب وگیاہ وادی ہی ہے۔ جدید زمانے کی تمام تر ترقیوں کے باوجود آج بھی مکہ کے پہاڑ خشک، کھیت وکھلیان ناپید اور ریت اور سنگریزوں کی ہر طرف بہتات ہے۔ چودہ صدیاں قبل اس وادی غیر ذی زرع کا تصور کیجئے کہ وہاں رہنے والوں کی زندگی کتنی کچھ دشوار ہوگی۔ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جنگ خندق (۸ ذیقعدہ۔۵ ہجری بمطابق ۳۱ مارچ ۶۲۷) کے بعد مشرکین مکہ کی معاشی حالت خطرناک حد تک بگڑ گئی۔ پے در پے جنگوں اور ان میں زر کثیر صرف کرنے کے باوجود عبرتناک شکستوں کے باعث اہل مکہ میں دل شکستگی تو تھی ہی اب وہ شدید معاشی تنگی کا شکار بھی ہو گئے تھے۔ ان کا معاشی انحصار صرف اور صرف تجارت پر تھا کسی قسم کی زرعی پیداوار ناپید تھی۔ اور تجارت بھی بند ہو چکی تھی۔ کیونکہ تجارتی راستے مخدوش ہو چکے تھے۔ حضور ﷺ کی پالیسیوں اور کاروائیوں سے اہل مکہ، سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر تنہا ہو چکے تھے۔ اس عالم میں ایک خوفناک قحط نے اہل مکہ کو گھیر لیا گھر گھر میں بھوک اور ننگ نے ڈیرے ڈال لیے۔

اگرچہ اہل مکہ کی تجارتی شاہراہ کھلی تھی، لیکن اس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ ابوسفیان اس وقت اہل مکہ کے سردار تھے۔ وہ بیچارے بہتیرے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ لیکن قحط کی شدت میں

اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بار برداری میں استعمال ہونے اونٹ بھی غذا کے لیے ذبح کیے جا رہے تھے۔ غلہ کو دیکھیے، عام کی کو مہینوں بیت گئے تھے گھروں ہانڈی چڑھنے کا رواج ختم ہو چکا تھا۔ بچوں کی ہڈیاں اور جوانوں کی پسلیاں گنی جانے لگیں۔ آس پاس کے قبائل کی طرف پیادے دوڑائے گئے۔ لیکن جواب نفی تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی خوفناک قحط کا شکار ہو چکے تھے۔ آ جا کے نظر مدینہ اور حاکم مدینہ پر ٹھیرتی تھی۔ مدینہ ویسے بھی سر سبز و شاداب علاقہ تھا۔ اب تو اس پہ رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی بھی تھی کہ جس سے زیادہ مدبر اور بابرکت حکمران اس زمین نے دیکھا تھا نہ ہی دیکھ سکے گی کچھ لوگوں صلاح دی کہ اس تنگی میں محمد ﷺ کے آگے ہاتھ پھیلائے جائیں، مگر کس منہ سے" کسی نے کہا آخر وہ ہمارے رشتے دار ہیں۔ ایک سردار نے بات کی۔ ہم نے کب اس رشتہ داری کی پرواہ کی تھی کہ ان سے کسی قسم کی امید رکھیں۔ دارلندوہ کی اس مجلس کے ایک اور شریک نے جواب دیا۔ سخت جھنجلاہٹ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ پہلے یمامہ کے حاکم اثامہ بن اثال کو غلہ کے لیے لکھتے ہیں۔ بعد میں جب کوئی بس نہ چلا تو محمد رسول اللہ ﷺ سے درخواست کریں گے۔ لہٰذا ایک وفد تشکیل دیا گیا جو یمامہ (نجد) پہنچا اور اثامہ بن اثال سے غلے کے لیے بات کی۔ اثامہ نے کہا کہ" تم کو غلہ نہیں دیا جائے گا جب کہ محمد رسول اللہ ﷺ اجازت نہ دیں"۔

اثامہ بن اثال ایک بڑا سردار تھا۔ نجد کے قبائل میں اسے حاکمیت حاصل تھی۔ ہجرت سے قبل ایک بار وہ مکہ آیا تو حضور پاک ﷺ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ آپ ﷺ نے حسب عادت اسے توحید کی دعوت دی۔ اس نے کہا: اے محمد چپ رہ ورنہ جان سے ماردوں گا"۔ مشرکین مکہ سے اس کے تجارتی تعلقات تھے۔ اس کے یہاں سے غلہ اور دیگر اجناس مکہ کی منڈی میں جایا کرتی تھیں۔ اب وہی اثامہ مسلمان ہو چکے تھے، قریشیوں کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ اب جب انھوں نے مکہ کو غلہ ترسیل روک دی تو اس سے اہل مکہ کو مزید پریشانی ہوئی۔ ان کا وفد ناکام واپس آ گیا۔ قحط میں اور شدت آ گئی۔ چار و نا چار انھیں والی مدینہ کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑے۔

حضرت اثامہ بن اثال کے ایمان لانے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے اور آنحضور ﷺ کی حکمت کا غماز ہے۔ محرم چھ ہجری کا زمانہ ہے رسول اللہ ﷺ کے گشتی وفود میں سے کسی وفد نے ایک شخص کو مشکوک پا

کر گرفتار کر لیا اور مدینہ پاک لا کر مسجد کے ستون سے باندھ دیا۔حضور ﷺ جب آئے تو اسے آپ کے حضور پیش کر دیا گیا۔آپ ﷺ نے پہچان لیا کہ یہ یمامہ کا سردار اثامہ بن اثال حنفی ہے۔کیونکہ آپ ﷺ قبل ازیں اس سے مل چکے تھے۔وہ مسیلمہ کذاب کے حکم سے بھیس بدل کر رسول اللہ ﷺ کے قتل کے ارادے سے نکلا تھا صحابہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔

(بحوالہ۔الرحیق المختوم)

آپ ﷺ نے اس سے کہا: اے اثامہ، کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تو اپنی بے دینی سے باز آ جائے۔بت پرستی چھوڑ کر اپنے بنانے والے اللہ کی عبادت کرے"۔اس نے کہا: مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔آپ ﷺ نے پوچھا: پھر بتاؤ تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔اس نے جواب دیا: اے محمد ﷺ اگر تجھے فدیہ کے مال کی ضرورت ہے تو جتنا چاہو دینے کے لیے تیار ہوں۔کیونکہ میں ایک مالدار آدمی ہوں۔اگر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو میں اس کا بھی مستحق ہوں کہ میں آپ کے لوگوں کا خون بہا چکا ہوں۔(غالباً اس نے قبل ازیں کسی مسلمان کو قتل کیا ہوگا) اور اگر احسان کرو تو ایک قدردان پر احسان کرو گے۔آپ ﷺ خاموش رہے۔پھر صحابہ کو حکم دیا کہ اس کو مسجد کے کسی ستون سے باندھ دو۔اسے اچھا کھانا کھلاؤ اور اس کے ساتھ اخلاق سے پیش آؤ۔روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی اونٹنی کا دودھ اس کے لیے بھیجا کرتے۔آپ ﷺ کو یہ فکر تھی کہ کسی طرح یہ ایمان لے آئے کہ اس سے اسلام کو بہت فائدہ پہنچنے والا تھا۔

آپ ﷺ آتے نماز پڑھاتے، پھر اس کے پاس کھڑے ہو کر اس سے گفتگو کرتے اسے اسلام کی دعوت دیتے۔اثامہ کا جواب وہی ہوتا یعنی انکار۔آپ ﷺ کئی روز اس کو اسلام کی دعوت دیتے رہے پھر ایک روز آپ ﷺ نے اسے پھر دعوت دی اور اس کے انکار پر صحابہ کو حکم دیا اس کو چھوڑ دو۔اثامہ ایک ذہین اور جی دار سردار تھا، اتنے دنوں سے وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی زندگی کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ان کے رہن سہن، نمازیں، زہد و تقوی، عبادات اور حضور محمد ﷺ کا حسن سلوک چنانچہ وہ آخر وہ اخلاق محمدی کا شکار ہو ہی گیا۔قریب کے کسی کنویں پر گیا غسل کیا اور واپس آ گیا۔اور دین اسلام میں داخل ہونے کا اعلان کر دیا۔کیا خوبصورت الفاظ تھے، وہ کہتا ہے: اے محمد ﷺ اب

سے چند لمحے قبل آپ میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت شخص تھے (خاکم بدہن) مگر اب میں دنیا میں سب سے زیادہ جس ہستی سے محبت کرتا ہوں وہ آپ ہیں۔ﷺ

اب یہی حضرت اثامہ بن اثال تھے جو قریش مکہ کے وفد کو اس بنا پر ذلیل کر کے نکال رہے تھے کہ وہ رسول اللہﷺ کے دشمن تھے۔ مکہ والوں کی غذائی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ آخر ابوسفیان کو اپنی انا ترک کرنا پڑی مجبور ہو کر وہ ذلت کا احساس لیے اب کے ساتھ ایک وفد والی مدینہ کی طرف بھیجتے ہیں۔ وہ آپﷺ سے التجا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: اے محمدﷺ، آپ ہمیشہ نیکی، مہربانی اور محبت کی تعلیم دیتے ہیں (افسوس کہ وہ اب تک اس محبت بھری تعلیم کو مان کر نہ دے رہے تھے) آپ اپنے ہم وطنو پر رحم کریں، وہ بھوک سے مر رہے ہیں۔ اثامہ بن اثال کو حکم دیں کہ وہ ہمارا غلہ بند نہ کرے۔ یہ پیغام ملتے ہی آپﷺ نے فوراً اثامہ بن اثال کو خط لکھاتے ہیں کہ اہل مکہ پر غلہ کی ترسیل سے بندش ہٹالی جائے۔ آپﷺ کا یہ اقدام دل موہ لینے والا تھا۔ اہل مکہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے والا تھا۔ اس رسول رحمت نے صرف اس حکم پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی طرف سے پانچ صد اشرفیاں بھی اہل مکہ کے لیے بھیجیں۔ یاد رہے اس وقت کے حساب سے یہ ایک بڑی رقم تھی۔ کیا اس سے مکہ کے غریب اور قحط زدہ لوگوں کے دلوں میں رسول رحمت کے لیے محبت کے دروازے نہ کھلے ہوں گے۔؟ اشرفیوں کے علاوہ آپﷺ نے مدینہ کی پیداوار از قسم کھجور اور دیگر اجناس بھی مکہ کو روانہ فرمائیں۔ وہ جو شکست خوردہ تھے، ہزیمت زدہ تھے مگر اب بھوکوں مر رہے تھے۔ یقیناً اس موقع پر ریاست مدینہ سے جو امداد آئی تھی اس کے معترف رہے ہوں گے۔

گردنوں میں جو سریا پڑا تھا تڑ تڑ کر کے ٹوٹا ہوگا۔ دلوں میں جو بغض بھرا تھا وہ یقیناً محبت میں تبدیل ہوا ہوگا۔ لیکن ان کا سردار ابوسفیان اب بھی بھناتا ہے اور کہتا ہے محمد (ﷺ) چاہتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو ورغلائے۔ بہرحال اس میں بھی اتنا دم خم نہ تھا کہ وہ اس امداد کو واپس بھجوا دیتا۔ اے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے والے نبی تجھ پر لاکھوں درود، تجھ پہ کروڑوں سلام، تالیف قلوب کے ذریعے قریش کو تحریک اسلام میں شامل کرنا آپﷺ کے مقاصد جلیلہ میں تھا۔ لہٰذا آپﷺ ایسا کوئی موقع ہاتھوں سے جانے نہ دیتے تھے۔ اور ایسا اقدام کرنے میں ذرا دیر نہ لگاتے تھے جس سے دل

مفتوح ہوں انسان اندرست بدلے۔دلوں کو جو فتح کرے وہی فاتح زمانہ۔

اللهمہ صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلمہ علیہ

سامنے میت کی تدفین ہو رہی ہے۔ نماز جنازہ ہو چکی ہے۔ کچھ لوگ قبر کے ارد گرد کھڑے تھے اور کچھ لوگ درختوں اور دیواروں کے سائے میں ستا رہے تھے۔ اپنے ساتھی کی جدائی کا غم دلوں میں لیے، زبانوں پر اس کے لیے مغفرت کی دعائیں کی جا رہی ہیں۔ ایک دیوار کے سائے میں فخر کائنات ﷺ بھی اپنے ساتھیوں سمیت اپنے صحابی کا جنازہ پڑھا کر تشریف فرما ہیں۔ محبان رسول بھی ارد گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ کہ یکا یک ایک آدمی آگے بڑھتا ہے، آپ ﷺ کو کپڑوں سے پکڑتا ہے اور انھیں کھینچتے ہوئے کہتا ہے، اے محمد ﷺ آپ میرا قرض کیوں ادا نہیں کرتے۔ خدا کی قسم، میں تم سب اولاد عبدالمطب کو خوب جانتا ہوں کہ پکے نادہندہ ہو۔ مجمع میں عجیب کھلبلی مچ گئی۔ صحابہ کرام والہانہ آگے بڑھے۔ آپ سے یہ رویہ اختیار کرنے والے ایک یہودی عالم تھے۔ زید بن سعنہ نام تھا۔ کسی ضرورت کے لیے اس یہودی سرمایہ دار سے چند دن قبل آپ ﷺ نے قرض لیا تھا حالانکہ معینہ مدت میں ابھی ایک آدھ دن باقی تھا کہ یہ آدمی اس طرح غیر اخلاقی رویہ اپنا رہا تھا۔ صحابہ کرام کا حصہ اور اشتعال دیکھنے کے لائق تھا۔ حضرت عمر فوراً آگے بڑھے اور اس کو پرے دھکیلتے

ہوئے کہا؛ او دشمن خدا کیا بکواس کرتا ہے۔ اگر اللہ کے رسول کا ادب مانع نہ ہوتا تو میں تمھاری گردن مار دیتا۔ قرض کا قصہ سنئے۔ زید بن سعنہ کا ہی بیان ہے کہ ایک دن میرے سامنے ہی مسجد نبوی میں ایک بدو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کی کہ جناب میری قوم مسلمان ہو چکی ہے اور میں نے ان کو دعوت دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم لوگ اسلام لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھرپور رزق دے گا۔ لیکن اب معاملہ یہ ہوا کہ قحط نے میری قوم کو گھیر لیا ہے اگرچہ میں اُن کو سمجھا تا رہتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہے اب اگر ان کو سہارا نہ پہنچایا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ رحمت کائنات ﷺ نے حضرت علی کی طرف مستفرانہ نگاہ کی انھوں نے عرض کی بیعت المال خالی ہے۔ آپ ﷺ اس قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے، خزانہ خالی تھا اس عالم میں اس یہودی عالم نے خود ہی یہ پیش کش کی کہ مجھ سے قرض لے لیں بعد میں ادا کر دیجئے گا۔ اس طرح آپ ﷺ نے اس بدو کی ضرورت مند قوم کے لیے ۸۰ مثقال سونا قرض لے لیا۔ اپنی اور ریاستی ضروریات کے لیے آپ ﷺ قرض لیتے رہتے تھے۔ عمومی طور پر حضرت بلال اور حضرت علی مالی معاملات کے نگران تھے۔ اور لین دین کا حساب رکھتے تھے۔ قرض کا لینا دینا انسانی معاشروں میں کوئی اجنبی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی شرماشرمی کی بات ہے۔ حساب کتاب صحیح رکھا جائے اور وعدوں کا پاس لحاظ کیا جائے تو قرض سے اپنی ضرورت پوری کر لینے میں کوئی عیب نہیں۔

سیدی خیر البشر ﷺ نے صحابہ کے اشتعال اور حضرت عمر کے سخت رویہ کو دیکھا تو حضرت عمر سے فرمایا اس موقعہ پر آپ کو چاہیے تھا کہ ایک طرف مجھے بہ حسن و خوبی قرض ادا کرنے کی نصیحت کرتے اور کو قرض کے مطالبہ میں نرمی کی نصیحت کرتے۔ آپ ﷺ ہر وقت اپنے ساتھیوں کی تربیت و تزکیہ میں منہمک رہتے تھے۔ اس واقعہ سے قرض کے معاملات میں احسن انداز اختیار کرنے کا سبق ملتا ہے۔ ادائے قرض میں حسن و خوبی یہ ہے کہ قرض لینے والے کو اس کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہیے اور وقت معینہ پر ادائیگی کو لازم جاننا چاہیے۔ قرض دینے والے کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے یہ نصیحت فرمائی ہے کہ اس میں نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اشتعال انگیزی اور ترش روئی آپس میں تعلقات کو بگاڑ دیتی ہے۔

آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا؛ کہ قرض دار کو مہلت دینے والا آدمی قیامت کے دن اللہ کی رحمت کے سائے میں ہوگا۔

(صحیح مسلم)

حضرت جابر سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ کی رحمت اس بندے پر جو بیچنے اور خریدنے میں اور حق کے تقاضا اور وصولی میں نرم اور فراخ دل ہو۔

(معارف الحدیث، جلد ہفتم، ص ۱۸۵، بحوالہ بخاری شریف)

حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ ایک آدمی جنت میں داخل ہوا تو اُس نے جنت کے دروازے پہ لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا اجر و ثواب دس گنا ہے، اور قرض دینے کا ثواب اٹھارہ گنا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف تو صحابہ کرام کو وسعت کی ترغیب دی کہ وہ ضرورت مند بھائیوں کو قرض دیں، اور اس کی ادائیگی کے لیے ان کو مہلت دیں۔ اگر وہ زیادہ نادار ہوں تو کل یا جزو جیسی بھی سہولت ہو قرض معاف کر دیں۔ اس کا بڑا ہی اجر و ثواب بیان ہوا ہے۔ دوسری طرف آپ ﷺ نے قرض لینے والوں کو بھی ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اس قرض کو ہضم کرنے کی بجائے جلد از جلد اس کو ادا کرنے اور اس بوجھ سے سبکدوش ہونے کی فکر کریں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری روای ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کہ ان کبیرہ گناہوں کے بعد جن سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے (جیسے شرک اور زنا) سب سے بڑا گناہ ہے کہ آدمی اس حال میں مرے کہ اس پر قرض ہو اور اس نے اس کی ادائی کا سامان نہ چھوڑا ہو۔

(مسند احمد، سنن ابوداؤد)

آپ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب کسی کا جنازہ سامنے رکھا ہوتا تو پوچھتے کہ میت پر قرض تو

نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو آپ ﷺ کی اس نماز کو ادا کرنے کا حکم دیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ میت پر قرض کے باعث آپ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ آپ ﷺ کی جانب سے آخری درجہ کی تنبیہ ہوتی تھی زندہ لوگوں کے لیے کہ آدمی کو اپنے قرض کی ادائیگی کی فکر ہونی چاہیے۔

مسلم شریف میں حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ:

ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے بتایئے کہ اگر میں اللہ کے راستے میں صبر اور استقامت کے ساتھ اور رب کی تعالیٰ رضا اور طلب آخرت ہی میں جہاد کروں، آگے بڑھتے بڑھتے شہید کر دیا جاؤں، پیچھے نہ ہٹا ہوں، تو کیا رب تعالیٰ میری خطائیں اور غلطیاں معاف فرما دیں گے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ ہاں پھر جب وہ آدمی لوٹنے لگا تو آپ ﷺ نے اسے پکارا اور فرمایا؛ مگر قرض نہیں۔

سرور عالم ﷺ نے حضرت عمر کو حکم دیا کہ اب جاؤ اور اس یہودی کے قرض ادا کرو۔ چونکہ تم نے اسے ڈانٹا تھا اس لیے اسے بیس صاع کھجوریں اضافی دینا۔ یہ ہے احسان کہ اس کے حق میں سے کچھ زائد اس کو عطا کرنے کا حکم دیا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا، زید بن سعنہ، ایک یہودی عالم تھے۔ یہ کچھ دنوں سے حضور ﷺ کے دعوائے نبوت کی جانچ کر رہے تھے۔ آپ ﷺ کے اندر چند نشانیوں کی تلاش میں تھے۔ جو یہودیوں کی کتابوں میں آخری نبی کے بارے میں موجود تھیں۔ آخری نشانی یہی تھی کہ وہ ترش رو قرض خواہ کے ساتھ بھی حسن سلوک اور نرمی کا رویہ اپنائیں گے۔ اور آج زید بن سعنہ کو یہ آخری نشانی بھی نظر آ گئی تھی۔ اس نے اسی مجلس میں اپنے دل کی بات کو کھول دیا اور دائرہ ایمان میں داخل ہو گیا۔ اور اپنا آدھا مال رسول اللہ ﷺ کی نظر کر دیا؛ رضی اللہ عنہ

اللهم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم عليه

ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی دلآویزی اور دلکشی اپنا راج کر رہی ہے۔شمع کے گرد پروانے اور محبوب کے گرد دیوانے اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ابھی ابھی چند لمحے قبل ہی تو صحابہ نے حضورﷺ کے دست حق پر مرنے مارنے کی قسمیں کھائی ہیں۔چشم فلک نے ایسا نظارہ کم ہی دیکھا ہوگا جو عروہ بن مسعود ثقفی نے غزوہ حدیبیہ کے موقع پر مشاہدہ کیا تھا۔اس موقع پر جب وہ آپﷺ سے مذاکرات کرنے کے بعد مکہ واپس آیا تو قریش کے سامنے مدنی کیمپ کا حال بیان کرتے ہوئے اس نے کہا؛اے قوم قریش!واللہ میں بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں،قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں۔واللہ میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کی رعایا اس طرح تعظیم کرتی ہو جس طرح محمد (فداہ امی وابی) کے ساتھی ان کی تعظیم کرتے ہیں۔واللہ وہ تھوکتے بھی ہیں تو لوگ ان کی ہتھیلی کو لے کر ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔اور جب آپ حکم فرماتے ہیں تو وہ اس کی تکمیل کو لپکتے ہیں۔اور جب آپ وضو کرتے ہیں تو وہ آپ کے وضو سے گرتے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔اور جب آپ بات کرتے ہیں تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے،اور ان کی عظمت وہیبت کے پیش نظر کوئی ان کو نظر بھر کر نہیں دیکھتا۔حدیبیہ،مکہ مکرمہ سے جدہ کی طرف ۲۲ کلومیٹر دور ایک مقام ہے جسے آجکل شمیسی کہتے ہیں۔یہیں سے حدود حرم شروع ہو جاتی ہے۔سن ٦ ہجری میں آپ کو خواب کے ذریعے

عمرہ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا۔ جس کی تعمیل میں آپ ﷺ اپنے ۱۴۰۰ سو جانثاروں کی معیت میں احرام باندھے، قربانی کے اونٹ لیے، یہیں حدیبیہ میں خیمہ زن تھے کیونکہ کفار قریش نے حرم کا راستہ روک رکھا تھا، اور مذاکرات اور سفارت کاری جاری تھی ۔ یہ سفارت کاری مختلف مراحل طے کرتی اب آخری درجے پر پہنچ چکی تھی ۔قریش کے سفیر اور سرکار مدینہ ﷺ کے درمیان زبانی معاہدہ طے پا چکا تھا۔ اب اس کو تحریر کرنے کی باری تھی ۔اس معاہدے کی شرائط پر صحابہ کرام کے دلوں میں شدید اشتعال پایا جاتا تھا۔ خاص طور پر معاہدے کہ یہ شرط بڑی اشتعال انگیز اور غیر منصفانہ تھی کہ مدت معاہدہ کے دوران اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر مدینہ آئے گا تو ریاست مدینہ اس کی واپسی کی پابند ہوگی۔ جب کہ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی مدینہ سے مکہ آئے گا تو اس کو واپس نہ کیا جائے گا۔ وہ صحابہ کرام جن کے قلبی تعلق اور آپ سے محبت اور آپ کے ادب و احترام کے مظاہر کی گواہی دشمن بھی دیتے تھے اب خاصے بھڑکے ہوئے تھے اور معاہدے کی شرائط پر رنجیدہ خاطر نظر آتے تھے۔ اُن کے جذبات مشتعل لیکن زبان بند تھی ۔ادھر اس معاہدے کو لکھا جانے لگا ادھر ایک زخمی نوجوان اپنے زخموں سے کراہتا بلکتا تڑپتا رسول اللہ ﷺ کے خیمے میں داخل ہوا، اس کے ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں، جسم زخم زخم، اور زخموں سے رستا ہوا بہتا ہوا لہو، یہ کون ہے؟ یہ ابوجندل ہیں، یہ تو قریش کے سفارت کار سہیل بن عمرو کا بیٹا ہے، لیکن اسلام قبول کر چکا ہے۔ مدینہ کے مسلمانوں کا دینی بھائی ہے۔

جناب ابوجندل کو اسلام قبول کرنے کی پاداش میں اس کے باپ نے محبوس کر رکھا تھا، اسے ایمان باللہ کے باعث طرح طرح کی اذیتوں کا سامنا تھا۔ ایک ستم تھا جوان پر ڈھایا جا رہا تھا۔ آج اپنی قید سے کسی طرح بھاگ کر اپنے مسلمان بھائیوں کے پاس پناہ کی تلاش میں آیا تھا۔ آج وہ اپنے آقا و مولیٰ کے قدموں میں آ گرا تھا، جن قدموں کے نیچے دنیا و آخرت کی بھلائیاں ہی بھلائیاں تھیں۔

جہاں محبت ہی محبت تھی، جس رحمت عالم کے دامن میں پناہ ہی پناہ تھی۔ ﷺ

قریش کے سفیر سہیل بن عمرو نے ابوجندل کو دیکھتے ہی کہا: اے محمد (ﷺ) یہ وہ پہلا شخص ہوگا جسے آپ ہمیں واپس کریں گے۔ طے شدہ معاہدے کے مطابق اس شخص کو میرے سپرد کر دیں۔ اُس کا

یہ مطالبہ سن کر صحابہ سن ہو کر رہ گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا؛ مگر ابھی معاہدہ تحریر تو نہیں ہوا، تھوڑی سی نرمی کرو۔ سہیل نے عمرو نے کہا؛ تحریر نہیں ہوا تو کیا ہوا، ہمارے درمیان معاہدہ طے پا چکا ہے۔ اگر آپ اس شخص کو واپس نہیں کرتے تو ہم ہماری طرف سے اس مصالحت کو ختم سمجھئے۔ سراپا رحمت، ختمی مرتبت ﷺ نے کہا؛ سہیل اسے میری خاطر چھوڑ دو۔ اُس نے جواب دیا؛ بالکل نہیں۔ ایک طرف زبانی معاہدہ تھا تو دوسری طرف ابو جندل کے زخموں سے ٹپکتا لہو۔ ایک طرف صحابہ کا بے پناہ اضطراب تھا تو دوسری طرف زبان کی پاسداری۔

کہنے کو تو زبان گوشت کا ایک لوتھڑا ہی ہے لیکن اس لوتھڑے نے دراصل انسان اور حیوان میں فرق پیدا کیا ہے۔ یہ گوشت کا لوتھڑا کتنا قیمتی ہے، ذرا ایک گونگے آدمی اور اپنے درمیان موازنہ کیجئے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ یہ زبان ہی ہے جو سارا دن آپ کا مافی الضمیر بیان کرتی ہے۔ یہ زبان ہی ہے جو آپ کے ذہن کے اندر اٹھنے والے خیالات دوسروں تک پہنچاتی ہے۔ یہ ایک حساس آلہ ہے جس کی نہایت نازک حرکات اور ان حرکات کے پیچھے اختلافات الفاظ اور ان کے مخصوص تلفظ کی شکل میں ڈھلتے ہیں۔ جتنی بڑی یہ نعمت ہے اتنی ہی بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو اگر تم دو چیزوں کی ضمانت دے دو تو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ ایک زبان دوسری شرم گاہ۔ گویہ یہ زبان ہے کہ جس کے ٹھیک استعمال سے جنت ملتی ہے اور غلط استعمال سے آدمی جہنم میں جا گرتا ہے۔

اسی طرح ایک بار جناب رسول کریم ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو اپنے ہاتھوں مبارک سے پکڑا اور فرمایا؛ اس کی حفاظت کرو۔ یعنی اس کے استعمال میں احتیاط برتو۔

حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ؛

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ آدمی جب صبح کرتا ہے تو اس کے سارے اعضا عاجزی اور لجاجت سے زبان سے کہتے ہیں (خدا کی بندی ہم پر رحم کرنا) اور ہمارے بارے میں خدا سے ڈر، کیونکہ ہم تیرے ہی ساتھ بندھے ہیں۔ تو ٹھیک رہی تو ہم بھی ٹھیک رہے گے۔ اگر تو نے غلط روی اختیار کی تو ہم بھی خسارے میں رہیں گے۔

زبان کے استعمالات میں سے ایک وعدہ کرنا ہے۔انسانی اخلاقیات میں وعدہ کی پابندی کرنا اور اپنی کی ہوئی بات پر پورا اترنا، ایک اہم اخلاقی قدر ہے۔جس انسانی معاشرہ میں اس قدر کو کما حقہ مقام دیا جاتا ہو اس میں خیر ہی خیر ہے۔وعدہ کر کے پورا کرنا در حقیقت سچائی ہی کی عملی قسم ہے۔اور وعدہ خلافی ایک عملی جھوٹ ہے۔یہی وجہ ہے کہ دین اسلام اپنی تعلیمات میں وعدہ پورا کرنے کو اور اپنی زبان کی حفاظت کرنے کو ازحد ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا ہے؛ **والموفون بعھدھم اذا عھدو ....** (نیک اور متقی لوگوں کی صفت ہے کہ وہ) جب وعدہ کرتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں"۔

(سورہ البقرہ...۱۷۷)

اسی طرح سورہ مومنوں میں فرمایا کہ:والذین ھم لاما نتھم وعھدھم راعون"...(کامیابی حاصل کرنے والے اور حقیقی مومن) وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیماں کا پاس رکھتے ہیں"۔

(سورہ؛المومنون۔۸)

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

جو امانت کی صفت نہیں رکھتا، وہ ایمان نہیں رکھتا۔اور جو عہد کا پاس نہیں کرتا وہ دین نہیں رکھتا"۔

بخاری و مسلم کی متفقہ روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ چار خصلتیں ہیں جس میں وہ چاروں پائی جاتی ہیں وہ منافق ہے۔ جس میں کوئی ایک پائی جائے اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت ہے۔جب تک کہ وہ کو نہ چھوڑے یعنی جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ خیانت کرے، جب بولے تو جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو توڑ دے، جب کسی سے جھگڑے تو ساری حدیں پھلانگ جائے"۔

عہد و پیماں کی پاسداری اور اپنی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا پہرہ دینا بعض اوقات نہایت مشکل امر بن جاتا ہے۔ایسی ہی مشکل ترین صورت حال کا سامنا تھا رسول اللہ ﷺ کو؛ کہ زخمی ابو جندل

آپ کے در پر پناہ کے حاضر ہوا مگر رسول اللہ ﷺ معاہدے کی وجہ سے خود کو اس امر سے عاجز محسوس کر رہے تھے۔ جب مخالف فریق نے انکار کر دیا تو آپ ﷺ نے کمال صبر وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے زخمی رفیق کو دشمنوں کے حوالے کر دیا۔

حضرت ابو جندل چودہ سو مسلمانوں کی بھاری جمعیت سے فریاد کر رہے تھے، کہ بھائیو تم مجھے پھر انھی بھیڑیوں کے حوالے کر رہے ہو۔ ذرا میری حالت تو دیکھو، اگر تم مجھے ان شدائد وآلام سے نجات نہ دو گے تو پھر میری مدد کو کون آئے گا۔ آنحضور ﷺ نے اس کو متقل کی طرف واپس کرتے ہوئے فرمایا میرے بھائی ہم زبان دے چکے ہیں۔ تمہیں واپس جانا ہوگا۔ صبر و ہمت سے کام لو رب تعالیٰ یقیناً تمھارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔

اے عہد و پیماں کے پاس کرنے والے رسول، آپ پر کروڑوں درود کروڑوں سلام۔

اللهم صلى على محمد و على محمد و بارك و سلم عليه

جنت اور دوزخ

”چنانچہ (یہ حقیقت ہے، اے لوگو، کہ) جب وہ بڑا ہنگامہ برپا ہوگا (تو یہ سب درہم برہم ہو جائے گا) اس دن، انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور دوزخ ان کے سامنے بے نقاب کر دی جائے گی۔ جو اس سے دوچار ہوں گے۔ پھر جو سرکش ہوا اور جس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو یہ دوزخ ہی ان کا ٹھکانہ ہوگی، اور جو اپنے رب کے حضور میں پیشی سے ڈرا اور اپنے نفس کو اس نے خواہشوں کی پیروی سے روکا تو بہشت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

(سورہ النازعات 79 : 34....41)

”کامیاب ہوا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور (اس کے لیے) اپنے پروردگار کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی۔ (نہیں، تم اس کے خلاف کوئی حجت نہیں پاتے، اے لوگو) بلکہ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، درآں حالیکہ آخرت (اس کے مقابلے میں) بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی“۔

(سورۃ الاعلیٰ ؛۱۴تا۱۷)

کمرے میں ہر طرف دھواں ہی دھواں ہی پھیلا تھا۔ ماحول پر افسردگی چھائی تھی۔ یہ مدینہ پاک کا ایک مضافاتی مکان ہے۔ صاحب خانہ لوہار کا کام کرتے ہیں۔ ان کی بھٹی سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے ہیں۔ سرور عالم ﷺ آج یہاں تشریف لائے ہیں۔ آج ان کے گھر کا منظر عجیب ہے۔ ایک طرف تو رحمت عالم ﷺ کی آمد کی خوشی ہے لیکن دوسری طرف آپ کے لخت جگر کی بیماری نے ماحول کو افسردہ بنا رکھا ہے۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت باہر صحن میں بیٹھی اپنے اللہ سے ننھے ابراہیم کی درازی عمر کی بھیک مانگ رہی ہے اور اندر رحمت کائنات ﷺ اپنے جاں بلب جگر گوشہ کو گود میں لیے ملتجی نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی عمر مبارک دس ہجری کو ۶۳ سال ہو چکی ہے۔ کہ اللہ نے آپ کو اولاد نرینہ سے نوازا۔ حضرت بی بی فاطمہ کو بھائی اور حسن و حسین کو ماموں عطا ہوا۔ ہر طرف جشن بہاراں تھا، کائنات کا ذرہ ذرہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نومولود کا نام اپنے جد امجد کے نام پر ابراہیم تجویز کیا۔ جناب ابراہیم کی والدہ محترمہ کا اسم مبارک بی بی ماریہ قبطیہ تھا۔ یہ حضور ﷺ کی کنیز تھیں جو مصر کے بادشاہ مقوقس نے آپ کو ہدیتاً پیش کی تھی۔ آپ ﷺ کے ہاں یہ بچہ کافی عرصہ کے بعد پیدا ہوا تھا۔ قبل ازیں آپ ﷺ کی اولاد میں دو بیٹے پیدائش کے چند ماہ بعد فوت ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام قاسم تھا انھی فرزند کی وجہ سے آپ

کی کنیت ابو قاسم تھی ۔ دوسرے کا نام عبداللہ تھا انھی کو طیب و طاہر کہا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں ۔ سب سے بڑی بیٹی زینب ، پھر اُم کلثوم ، پھر رقیہ اور حضرت بی بی فاطمہ تھیں ۔ لیکن جناب ابراہیم کی پیدائش کے وقت صرف حضرت فاطمہ کی بقید حیات تھیں ۔ اولاد کا کونسا دکھ ہے جو میرے محبوب ﷺ کو برداشت نہیں کرنا پڑا۔ بیٹے نو عمری میں ہی داغ جدائی دے گئے ۔ اور بیٹیاں بھی سوائے زہرہ بتول کے محترم باپ کی آنکھوں کے سامنے ہی فردوس بریں کو سدھاریں ۔ اور اب ڈھلتی عمر میں رب تعالیٰ نے اولاد ذکور عطا کر کے خوشیاں عطا فرمائی تھیں ، یا محسن انسانیت کا کوئی اور امتحان مقصود تھا۔ یہ تو پردہ غیب میں تھا ، ہاں البتہ ظاہری طور پر ابراہیم کے آنے سے میرے محبوب کے آنگن میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی تھی ۔ بچہ نہایت خوبصورت اور اتنا صحت مند تھا کہ روایات میں آتا ہے کہ ان کا جسم گہوارے کو بھر دینے والا تھا ، عرب رواج کے مطابق ابراہیم کو مدینہ پاک کے مضافات میں دودھ پلانے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ دایا ابراہیم کا نام ام برزہ بنت منذر تھا۔ ان کے شوہر کا نام براء بن اوس انصاری تھا اور وہ لوہار کا کام کرتے تھے ۔ آپ ﷺ گاہے بگاہے اس مکان میں تشریف لے جاتے ۔ جانثار صحابہ ہمراہ تشریف رکھتے ۔ ایک عاشق کا بیان ہے کہ حضور ﷺ ابراہیم سے ملنے مدینہ کے جس مکان میں جاتے وہ دھویں سے اٹا ہوتا ۔ آپ بلا تکلف اس میں تشریف رکھتے ۔

بچے کو گود میں لیتے ، پیار کرتے اور لب نبوت سے ننھے ابراہیم کے بوسے لیتے اور ساری شفقت و رافت اس پر نچھاور کرتے ۔ اس صحابی کے بقول میں نے کسی شخص کو نبی اکرم ﷺ سے زیادہ اپنے اہل و عیال پر رحم کرنے والا نہیں پایا۔ روایات میں آتا ہے کہ بچوں کے لیے آپ ﷺ نہایت شفیق تھے ۔ ان کے پاس سے گزرتے تو خود ان کو سلام کرتے ۔ ان کے سر پر ہاتھ رکھتے اور بعض اوقات ان کو گود میں اٹھا لیتے ۔ ابراہیم تو اپنے جگر کا ٹکڑا تھا ، اس سے جتنی محبت ہو سکتی ہے آپ خود تصور کر سکتے ہیں ۔ ننھا ابراہیم اپنی دایہ کے ہاں پرورش پاتا رہا۔ دن پہ دن گزرتے رہے ۔ عظیم باپ اور اس نونہال کے درمیان رشتہ الفت و محبت گہرا ہوتا چلا گیا۔ ابراہیم نے بیٹھنا شروع کیا ، پھر ابراہیم نے چلنا شروع کیا۔ اپنی توتلی زبان سے اپنے عظمتوں اور شانوں والے باپ کا کلمہ پڑھنا شروع کیا۔

ماں اس کو دیکھ دیکھ کے جیتی تھی اور باپ اس سے ملنے کے لیے نبوت کی جدو جہد و کاوش سے وقت نکلنے کے منتظر رہتے۔اس کی عمر تقریباً اٹھارہ ماہ تھی کہ ایک دن حضورﷺ کو مدینہ طیبہ میں اطلاع ملی کہ ابراہیم سخت بیمار ہیں۔

حضورﷺ حضرت ابراہیم کو لے کر فوراً پہنچے۔حضرت اُم برزہ کے گھر پہنچ کر آپﷺ کمرے میں تشریف لے گئے۔جاں بلب ابراہیم کو اپنی گود میں اٹھایا اور پیار کیا۔حضرت ابراہیم آخری سانس لے رہے تھے۔آپﷺ کی آنکھوں میں سمندر اتر آئے۔ابراہیم کو پیار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا؛ ابراہیم حکم الٰہی کے ہم تیرے کسی کام نہیں آسکتے"۔ننھے ابراہیم نے اپنے عظیم باپ کی باہوں میں ہی حکم الٰہی پر لبیک کہا اور جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ **انا للہ و انا علیہ راجعون** ۔بے شک ہم سب اللہ کی ملکیت ہیں اور اسی طرف ہم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔چشم نبوت سے موتی بہہ نکلے۔موت بہرحال موت ہے۔زندوں کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ حقیقت یہی موت ہے۔

سیدی خیر البشرﷺ کی آنکھوں سے رواں آنسو دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق وعمر نے فرمایا: آپ علم الٰہی کے رازداں ہیں اور آپ آبدیدہ! یہ کیا بات ہوئی؟ فخر موجودات نے ارشاد فرمایا؛ اگر چہ آنکھیں اشکبار ہیں۔دل غمناک ہے لیکن ہم وہ بات اپنی زبان سے ہرگز نہیں نکالیں گے جو ہمارے مالک کو ناپسند ہو۔موت برحق ہے۔اور میدان حشر میں جمع ہونا بھی امر حق ہے۔پیچھے رہ جانے والے بھی آخر آگے جانے والوں سے جاملیں گے۔

(یعنی اس میت پر ہی کیا موقوف ہم زندہ بھی ایک دن مر جائیں گے) ابراہیم کی جدائی کا غم ان آنسوؤں سے کہیں زیادہ ہے۔اس کی موت کا الم کہیں شدید ہے۔موت ایک اٹل حقیقت ہے۔کبھی کسی گروہ نے اس سے انکار نہیں کیا۔کیونکہ اس کا مشاہدہ روز ہر آدمی کرتا ہے۔البتہ زندگی بعد الموت سے لوگ انکاری رہے ہیں۔انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیمات پیش فرمائی ہیں ان میں آخروی زندگی کا عقیدہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔موت ایک اٹل حقیقت ہونے کے باوجود اپنی اصل میں انتہائی افسردگی اور رنج والم کی حامل ہوتی ہے۔اپنی موت کا ذائقہ چکھنے سے قبل کم وبیش ہر آدمی کو آئے دن اس سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔رنج والم فطری بات ہے۔ایسے موقع پر انسان کو صبر

اور برداشت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

ایسے موقع پر ایک مسلمان کا رویہ کیا ہونا چاہیے! کیا چیخ و پکار اور آہ وبکا کرنا چاہیے۔ ماتمی لباس زیب تن کرنا، مخصوص رسوم ماتم اختیار کرنا اور زبان سے کلمات ماتم نکالنا، کیا ضروری ہے؟ یہ ہیں وہ سوالات کہ جن کے جواب درج بالا واقع میں اسوہ حسنہ کی شکل میں حضور ﷺ نے امت کو عطا کئے ہیں۔ اس موقع پر وہ خط بھی ملاحظہ فرمائیں جو رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل کو ان کے بیٹے کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اموات کے مواقع پر اسوہ حسنہ پر اس خط میں بہترین روشنی موجود ہے۔ آپ ﷺ نے لکھا کہ:

> ''السلام وعلیکم؛ میں تیرے لیے اس اللہ سے دُعا کرتا ہوں جو اکیلا ہے اور جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ بعدازیں ہم یہ دُعا کرتے ہیں کہ بیٹے کی وفات پر اللہ تجھے صبر کی توفیق دے۔ اور صبر کرنے پر اجر بھی عطا فرمائے۔ اور ہم سب کو شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ ہماری جانیں ہمارے اہل وعیال اور ہمارے متعلقین سب اللہ کے عالی مرتبت عطیات اور اس کے بھرپور انعامات ہیں۔ جن سے ہم محدود وقت تک متمتع ہوتے ہیں اور وقت مقررہ پر یہ نعمتیں ہم سے چھین لی جاتی ہیں۔ لہٰذا جب اللہ یہ نعمتیں عطا کرے تو ان پر اس کا شکر ادا کرنا ہم پر فرض ہے۔ اور جب وہ ہم سے اپنی امانتیں واپس لے کر آزمائش میں ڈالے تو چاہیے کہ اس وقت ہم اس پر صبر کریں۔ تمھارا یہ بیٹا بھی اللہ تعالیٰ کے ان پاک عطیات میں سے تھا اور اس کی ہی امانت تھا۔ اس نے ہی اسے تمھارے لیے لطف وسرور کا ذریعہ بنایا تھا۔ اور اب اس بے نیاز خدا نے ہی اسے تم سے چھین لیا ہے۔ اب وہی اس کے بدلے تمہیں ہدایت، رحمت اور برکت سے نوازے گا، بشرطیکہ کہ تو صبر کرے اور اس کی رضا پر راضی رہے۔ اے معاذ دو باتیں کبھی جمع نہ کرنا۔ ایک یہ کہ اس موت پر چیخ وپکار شروع کردے، اس سے صبر گنوا بیٹھو گے۔ اور یہ کہ جو تجھ سے چھن جائے اس پر افسوس کرنے بیٹھ جائے، پس اگر تو اپنی مصیبت اور آزمائش پر صبر کے اجر پر یقین رکھے، اپنے رب کی اطاعت کرے اور اس

سے کیا ہوا وعدہ پورا کرے تو تجھے معلوم ہو کہ اس سے تمھاری مصیبت کم ہو جائے گی۔ اور یہ جان لے کہ جزع وفزع سے مرنے والا واپس نہیں آتا۔ اور نہ ہی اس سے غم دور ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنی جزا کو بہتر بناؤ اور اپنا وعدہ پورا کرو۔ اس سے اللہ کی رحمت نازل ہو گی۔ تیرا غم دور ہوگا اور ویسے بھی جو ہونا تھا وہ ہو چکا"۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

جگر گوشہ رسول کی وفات کے دن سورج کو گرہن لگا۔ بعض لوگ عقیدتاً کہنے لگے کہ سورج بھی جناب ابراہیم کے سوگ میں گہنا گیا ہے۔ سرور عالم ﷺ نے اس کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا؛ جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ سورج گرہن یا چاند گرہن یا اس قسم کی کوئی اور چیز اللہ کی نشانیاں ہوتی ہیں یہ اپنے اپنے وقت اور ضابطے کے تحت ہوتی ہیں ان کا کسی کی پیدائش یا موت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اللھم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم علیہ

واپسی کا سفر جاری تھا۔ جب آئے تھے تو صرف دو تھے، اب واپس جا رہے ہیں تو دس ہزار کا جمِ غفیر ساتھ ہے۔ مکہ سے جب چلے تھے تو کسی کو واپسی کا یقین نہ تھا اب واپس جا رہے ہیں تو اہل مکہ ابھی تک بے خبر ہیں۔ تب سے اب تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ وہ بھی کیا حالات تھے جب مشرکین مکہ حضور ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ کسے خبر تھی رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرنے والا خدا علیم بھی ہے قادر بھی، اور پھر چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ آمنہ کا دریتیم اپنے قاتلوں کے درمیان سے اس طرح بحفاظت نکال لیا گیا جس طرح مکھن سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ کیا ہوا اگر طائف اور مکے کی سنگلاخ زمین نے اسلام کو قبول کرنے کی بجائے سختی سے رد کر دیا تھا تو نور ہدایت کا یہ بیج مدینہ پاک کی زرخیز زمین نے قبول کر کے اپنے جگر گوشوں کے جواں لہو سے سینچ کر اسے اب شجر سایہ دار بنا دیا تھا۔ وادی غیر ذی زرع سے نکلے آٹھ سال ہو چکے تھے، کہ رمضان ۸ ہجری کو محبوب کائنات ﷺ نے اپنے جانثار صحابہ کو مکہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ حالات جس رخ جا رہے تھے، مسلمانوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ جلد یا بدیر اب مکہ پر چڑھائی ہوا چاہتی ہے۔ اب حالات دھیرے دھیرے اسی جانب بڑھ رہے تھے اب وقت آ گیا تھا کہ مکہ میرے محبوب ﷺ

کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔وہ مکہ جس کی سنگلاخ زمین نے بلال وصہیب کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی تھی ۔ وہ مکہ جس کی گلیوں میں چشم فلک نے محبوب کائنات کے ساتھ سفاکانہ سلوک ہوتے دیکھا تھا آج باہیں پھیلائے ،اسلام کواپنی آغوش میں لینے کا منتظر تھا۔ابوسفیان کی طرف سے تجدید معاہدہ حدیبیہ کی کوششوں کوٹھکرا دینے کے بعد حضورﷺ نے مکہ پر چڑھائی کا فیصلہ فرمالیا تھا۔ آپﷺ نے سب صحابہ کو بلا کر اعلان فرمادیا کہ مکہ چلنا ہے تیاری کرلو،ساتھ ہی آپﷺ نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ: جاسوسوں اور خبروں کو قریش تک پہنچنے سے روک لے ۔تا کہ ہم ان کے علاقے میں ان کے سر پر ایک دم جا پہنچیں ۔ مدینہ طیبہ سے دس رمضان المبارک کو روانگی ہوئی ۔راستہ میں مختلف مقامات پر پڑاؤ کرتے اور چلتے چلتے مکہ کے قریب مہر لظہران میں آخری پڑاؤ کیا۔ اس جگہ کو آج کل وادی فاطمہ کہتے ہیں ۔دس ہزار صحابہ کو حکم دیا گیا کہ فاصلے فاصلے سے اپنے خیمے گاڑیں ۔رات دور دور تک آگ کے آلاؤ روشن کئے جائیں ۔اس میں حکمت یہ تھی کہ اگر دشمن کہیں قریب موجود ہوتو اسے تعداد زیادہ دکھائی دے۔ یہ ایک وسیع ریگستانی علاقہ ہے۔صحراؤں کی مخصوص جڑی بوٹیاں اور جانور اور پرندے پائے جاتے ہیں۔روایات میں اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ حضورﷺ کے اسفار میں ایک قسم کا حسن نظم پایا جاتا تھا۔سفر کی منازل طے ہوتی تھیں ۔

ایڈوانس پارٹی روانہ کی جاتی تھی ۔اور ایک صحابی کی ڈیوٹی قافلے کے پیچھے آنے کی بھی ہوتی تھی تا کہ پڑاؤ پر بچی کھچی چیزوں کو سنبھال سکیں ۔ جانوروں کی دیکھ بھال پر الگ گروہ تشکیل دیا جاتا۔اشیاءِ خور نوش کی فراہمی اور پانی تلاش اور اس کی فراہمی پر الگ گروہ کی ڈیوٹی ہوتی۔کھانا پکانے کے انتظامات میں بھی تقسیم کار کا اصول کارفرما ہوتا۔اسی طرح رات کو پہرے پر بھی ڈیوٹیاں لگائی جاتیں۔حتیٰ کہ کوڈ ورڈ زاور پاس ورڈ ز کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ان اسفار میں حضور نبی اکرمﷺ جس طرح چلتے تھے اس میں ہمارے لیے نمونہ موجود ہے۔اگر چہ صحابہ کرام آپﷺ کا بے پناہ ادب واحترام بجالاتے تھے اور آپ کے ایک اشارہ ابرو پر جانیں نچھاور کرنے کو سعادت سمجھتے تھے،لیکن سرور عالمﷺ ان کے درمیان برابر کے شریک رہتے تھے ۔ ہر طرح کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے، گفتگو میں شریک ہوتے ،دکھ سکھ میں ساتھ رہتے ۔ وادی فاطمہ میں جب پڑاؤ ڈالا گیا تو اس کے جھاڑی نما درختوں

میں پیلو پک چکے تھے۔ پیلوایک صحرائی پھل ہے۔رس بھرے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے دانے ہوتے ہیں۔ یہ عین گرمی کے موسم میں پکتا ہے۔اس کا درخت ریگستانوں کا خودرو پودہ ہے فتح مکہ کے لیے جاتے ہوئے جب وادی مہرالظہر ان میں پڑاؤ ڈالا گیا تو صحابہ کرام پیلو کے درختوں کی طرف دوڑے۔اور رنگ برنگ پیلو توڑ کر کھانے لگے۔حضور ﷺ اپنے خیمے سے باہر تشریف لا کر صحابہ کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔رسول رحمت ﷺ نے فرمایا؛ خوب سیاہ سیاہ پیلو توڑو۔وہ پلیو توڑ کر کھانے لگے۔حضرت عبداللہ بن مسعود بھی ایک درخت پر چڑھ گئے۔یہ کمزور جسم کے تھے۔ان کی پتلی پتلی ٹانگیں ،کل قیامت کے روز میزان عدل میں اُحد پہاڑ سے بھی بھاری ثابت ہوں گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود یہ سن کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔درخت پر چڑھے ہوئے تھے۔ اچھی اچھی پیلو تور توڑ کر سنبھالتے جا رہے تھے اور باقی خود کھا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اتر کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ جمع شدہ پیلو پیش کیں۔کہنے لگے یہ پھل میں توڑ کے لایا ہوں۔اور عمدہ بھی اس میں موجود ہیں۔(یہ خاص آپ کے لیے ہیں)۔جب کہ ہر توڑنے والے کا ہاتھ اپنے منہ کی طرف جاتا تھا۔

کیا خوبصورت اور بے تکلفی کا ماحول تھا!

کیا اچھی دوستی اور عمدہ رفاقت تھی!

اور سیدنا عبداللہ بن مسعود کی خوش بختی کے کیا کہنے کہ سیدی خیر البشر ﷺ کے لیے پیلو توڑ لانے کی سعادت حاصل کر رہے تھے۔

این سعادت زور بازو نیست!

صحابہ کرام جہاں رسول اللہ ﷺ کا بے پناہ ادب واحترام کرتے تھے وہاں وہ آپ کے ساتھ بے تکلف بھی تھے۔ان کے درمیان پیار و محبت کا ایسا لازوال رشتہ تھا جس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ آپ ﷺ کی محفل میں سنجیدگی تھی، خشکی نہ تھی۔ادب واحترام تھا کوئی خوف ودبدبہ نہ تھا۔بے تکلفی اور مزاح تھا لیکن ایک وقار کے ساتھ۔مسلم و بخاری میں حضرت انس کی روایت ہے کہ مہرالظہر ان میں ہم نے ایک خرگوش دیکھا، اسے بھگایا، لوگ اس کے پیچھے بھاگے اور تھک گئے۔حضرت انس

کہتے ہیں کہ میں اس کو پکڑ لایا۔ابوطلحہ نے اسے ذبح کیا۔رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس کی ران پیش کی گئی۔آپ ﷺ نے خوشی سے اسے قبول فرمایا؛

کیا خوش قسمت لوگ تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت اقدس میں تحفے پیش کرتے اور شرف قبولیت پاتے ۔ ہم کہ جو پندرہ صدیوں کے فاصلے پر بیٹھے ہیں ،کیا کریں۔کون سے تحائف حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کریں۔آیئے درود وسلام کے تحفے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کریں کہ ہم یہی کرسکتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ o

لمعہ نور 25: اک انداز دلبرانہ

سیدنا ابو موسیٰ اشعری یمن کے رہنے والے تھے۔ وہیں شرف ایمان سے فیض یاب ہوئے۔ اُس وقت سیدی خیر البشر ﷺ ابھی مکہ میں قیام پذیر تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری اپنے قبیلے کے افراد کو لے کر سید انسانیت کی خدمت میں حاضری کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کی کشتی راستہ بھٹک گئی اور یہ لوگ حبشہ جا پہنچے۔ وہاں مکہ سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمان پہلے سے موجود تھے۔ اس طرح اشعری قبیلے کے مسلمان بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ یہ لوگ فتح خیبر کے موقع پر سن ۷ ہجری میں مدینہ تشریف لائے۔ اس کے بعد حضرت ابو موسیٰ اشعری نے کوشش کی کہ وہ ہر لمحہ سید عالم ﷺ کے دربار اقدس میں حاضر رہیں۔ تا کہ زیادہ سے زیادہ دین بھی سیکھیں اور اپنے محبوب کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوں۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے اپنے گھر میں وضو کیا، کپڑے تبدیل کیے اور اچھی طرح تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ دل میں یہ عہد کیا کہ سارا دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہوں گا۔ آپ جو حکم دیں گے بجالاؤں گا جو کام آپ سر انجام دیں گے ان کا بغور مشاہدہ کروں گا۔ کیسی خوش بخت تھیں یہ ہستیاں!!

کیسے اعلیٰ مقدر تھے ان حضرات کے!!

سبحان اللہ العظیم !!

آپ ذرا تصور کریں کہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری نے آج کتنا عمدہ ارادہ کیا تھا۔ اور میں قربان جاؤں ان حضرات کے سوہنے مقدر پر کہ ان مقدس ہستیوں کو کتنے اعلیٰ مواقع حاصل تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں جب مسجد نبوی میں پہنچا تو حضور ﷺ وہاں سے کسی طرف تشریف لے گئے تھے۔ انھوں نے وہاں پر موجود لوگوں سے استفسار کیا کہ آنجناب ﷺ کس طرف کو تشریف لے گئے ہیں۔ لوگوں نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ فخر کائنات ﷺ اس طرف گئے ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ میں اس سمت کو روانہ ہو گیا۔ آپ ﷺ کے نقش مبارک پر چلتا گیا اور آگے جانے والوں سے آپ کے متعلق پوچھتا بھی گیا۔ چلتے چلتے اور پوچھتے پچھاتے میں باغ اریس جا پہنچا۔ یہ باغ قبا کی ایک بستی میں مسجد قبا کے پاس تھا۔ اس میں ایک کنواں بھی تھا۔ جس کا پانی میٹھا اور خوشگوار تھا۔ آپ ﷺ کبھی کبھار اس باغ میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اور اس کا میٹھا پانی شوق سے نوش فرمایا کرتے تھے معلوم ہوا کہ حضور اسی باغ کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔

سیدنا ابوموسیٰ بیان کرتے ہیں کہ میں باغ کے اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے آقا ایک انداز دلنواز کے ساتھ کنویں کی منڈیر پر تشریف فرما ہیں۔ آپ نے اپنی پنڈلی مبارک سے کپڑا اٹھایا ہوا ہے اور ٹانگوں کو کنویں میں لٹکایا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا اور واپس آ کر باغ کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ ایک جانثار محافظ کی طرح، ایک باوفا عاشق کی طرح، باغ کا یہ دروازہ کھجور کی ڈالیوں کا بنا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نجانے کن خیالوں کے تحت یہاں اتنی دور شہری زندگی سے پرے تشریف لائے تھے۔ اس لیے سیدنا ابوموسیٰ اشعری نے مناسب جانا کہ آپ کو تنہا چھوڑ دیا جائے اور خود دور بیٹھ کر حفاظت بھی کرتے رہے اور محبوب عالی کے دیدار سے اپنی پیاس بھی بجھاتے رہے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ سیدنا ابوبکر بھی اس طرف تشریف لے آئے اور باغ کے اندر جانا چاہا۔ حضرت ابوموسیٰ نے عرض کی آپ یہاں دروازے پر رکیں میں رسول اللہ ﷺ سے آپ کے لیے اجازت لے آؤں۔ وہ اندر گئے اور عرض کی دروازے پر سیدنا ابوبکر اجازت کے طلبگار ہیں۔ سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا انھیں اندر آنے دو اور ساتھ ہی انھیں جنت کی بشارت بھی دے دو۔

ابو موسیٰ واپس دروازے پر آئے اور سیدنا ابو بکر کو اندر تشریف لے جانے کو کہا اور ساتھ ہی حسب ارشاد پیغمبر آنجناب کو جنت کی بشارت بھی دی۔اور خود پہلے کی طرح دربانی کا کا شرف حاصل کرتے رہے۔سیدنا ابو بکر بھی کنویں کی منڈیر پر جا کر آپ کے دائیں ہاتھ جا بیٹھے۔اور حضورﷺ کی طرح اپنی پنڈلیاں کھول کر پاؤں کنویں میں لٹکا لیے۔

کیا ہی خوبصورت اور بے تکلفانہ ماحول ہے!!

دونوں دوست کس انداز سے مصروف گفتگو ہیں۔

سبحان اللہ و بحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔

دروازے پر بیٹھے ابو موسیٰ کے دل میں خیال آیا کہ اللہ کرے میرا بھائی بھی اس طرف آ جائے اور رحمت وسعادت کے اس بہتے دریا سے مستفید ہو۔وہ گھر میں وضو تو کر رہا تھا۔گویا دربار اقدس میں حاضری کا ارادہ تو رکھتا تھا۔شاید اللہ کریم اُس کو اس طرف لے آئے۔وہ یہ سوچ رہے تھے کہ باغ کا دروازہ knock ہوا۔انھوں نے پوچھا کون ہے کہا؛ عمر ہوں۔عرض کیا ذرا رکئے میں اجازت لے آؤں۔وہ رسول اللہﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی ؛ عمر اندر آنے کے خوستگار ہیں۔سید عالمﷺ نے ارشاد فرمایا انھیں اندر آنے دو اور ساتھ ہی انھیں جنت کی بشارت بھی دے دو۔ابو موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ میں دروازے پر اور حسب حکم سرکار سیدنا عمر کو اندر تشریف لانے کو کہا اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنائی کہ حضورﷺ نے آپ کو جنت کی بشارت دی ہے۔

سیدنا عمر رسول اللہﷺ کی طرف گئے اور اپنے دوستوں کو سلام کیا۔جس کا دونوں نے عمدگی سے جواب دیا۔حضرت حضورﷺ کے بائیں طرف کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور انھی کی طرح پنڈلیوں سے کپڑا اوپر کر کے پاؤں کنویں میں لٹکا لیے۔

کیا شاندار منظر ہو گا یہ!!!

فطری ماحول میں فطرت کے قریب تر!!

تمام تر جھمیلوں اور مصروفیتوں سے دور پرسکون اور دلکش ماحول،آلودگیوں سے پاک اور صاف منظر میں،پھر یہ کہ جس بے تکلفانہ انداز سے یہ ہستیاں تشریف فرما ہیں اُس پر میں قربان جاؤں!!

قربان جاؤں!!

ابوموسیٰ اشعری پھر اپنی ڈیوٹی پر پہنچ چکے تھے۔اور اب بھی یہ چاہ رہے تھے کہ کاش اس خوش بخت لمحے میرا بھائی عامر بھی شریک ہو جائے، اللہ کرے یہ سعادت اس کے حصے میں بھی آ جائے، اسی اثناء دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ پوچھا؛ کون؟ کہا عثمان ابن عفان، کہا، ٹھہریے آپ کے لیے اجازت لے آؤں ۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا دواز ے پر جناب عثمان تشریف لائے ہیں اور حاضری کے طلبگار ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ انھیں آنے دو اور جنت کی خوشخبری بھی دو لیکن ایک مصیبت اور بڑے امتحان کے بعد! وہ گئے اور دروازہ کھولا اندر آنے کو کہا اور جو پیغام دیا گیا تھا وہ سیدنا عثمان کو پہنچایا۔ سیدنا عثمان نے اس بڑے امتحان کے بارے میں سوچتے سوچتے اہل بئیر کے پہنچے۔ سلام عرض کیا؛ اور انھی کے سے انداز میں لیکن منڈیر کے دوسرے کنارے کی طرف بیٹھ گئے۔ اس روایت سے سیدی خیر البشر ﷺ کی مقدس زندگی کے کئی پہلو عیاں ہوتے ہیں جن میں سے ہم صرف اُس اندازِ دلنواز کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، جو آپ ﷺ نے کنویں کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے اختیار فرمایا۔

اللهم صلى على محمد و على محمد و بارك و سلم عليه

لمعہ نور: 26 اللہ کی نعمتیں

سیدنا ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ:

ایک روز حضور پاک ﷺ، بھوک کے باعث گھر سے باہر تشریف لائے۔ یہ معلوم نہیں کہ دن کا وقت تھا کہ رات کا، آپ ﷺ نے دیکھا کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر بھی باہر تشریف لائے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان دونوں سے پوچھا؛ کیا چیز تمہیں اس وقت گھروں سے باہر لائی ہے۔ وہ بولے؛ بھوک۔ سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ ہمیں بھی بھوک نے ہی ستایا ہے اور اس لمحے گھر سے باہر نکالا ہے۔ چلو اٹھو میرے ساتھ آؤ۔

راوی کا بیان ہے کہ، تینوں ایک دوست کی طرف روانہ ہوئے۔ اور شہر مدینہ میں واقعہ ایک صحابی کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت گھر پر موجود نہ تھے۔ اس کی بیوی نے جب تینوں ساتھیوں کو دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔ اس نے حضور ﷺ کو خوش آمدید کہا۔ مرحبا، مرحبا، یا رسول اللہ ﷺ خوش آمدید، چشم روشن دل ماشاد۔

مدنی آقا ﷺ نے پوچھا؛ صاحب خانہ کہاں ہیں؟

(بعض روایات میں ان صاحب کا نام ابو الہیثم بن التیہان بیان ہوا ہے)۔

وہ محترم خاتون بولی؛بسمہ اللہ آپ تشریف رکھیے،صاحب خانہ ابھی آتے ہوں گے۔

وہ ہمارے لیے قریبی کنویں سے میٹھا پانی لینے گئے ہیں۔

آپ ﷺ اپنے دوستوں سمیت رونق افروز ہو گئے ۔اس دوران وہ انصاری صحابی تشریف لے آئے۔اس نے جب سید عالم ﷺ کو اپنے گھر میں رونق افروز دیکھا تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ وہ کہنے لگے۔اہلاً وسہلاً مرحبا؛ الحمدو للہ۔آج کا دن کتنا مبارک ہے۔میرے مہمانوں سے زیادہ مکرم مہمان کسی اور کے گھر نہ ہوں گے۔

کیسی شاندار حقیقت بیان کی اس صحابی نے،اللہ ان سے راضی ہو!

واقعتاً سیدی خیر البشر جس گھر میں تشریف لائیں ان سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہوسکتا ہے۔

وہ انصاری صحابی خوشی خوشی اپنے باغ میں گئے اور کھجور کا ایک پورا خوشہ توڑ لائے۔

اس خوشے کی پکی پکی رس بھری کھجوریں بھی اور ادھ پکی لذیذ کھجوریں بھی۔اور کچھ کچے کچے پھل بھی تھے ۔عرض کیا کہ حضور ﷺ میں قربان بہ دل وجان؛ آپ انھیں تناول فرمائیں اس دوران یہ غلام کھانے کا بندوبست کرتا ہے۔اُس نے چھری پکڑی اور اپنے جانوروں کے باڑے کی طرف بڑھا۔ تاکہ اپنے معزز مہمانوں کے لیے کوئی بکری ذبح کرے۔یہ دیکھ کر میرے آقا نے اسے فرمایا؛ دودھ دینے والی بکری ذبح نہ کرنا۔سبحان اللہ میں قربان جاؤں رسول رحمت کے کہ کس طرح میزبان کا خیال رکھ رہے ہیں۔

فرمایا دودھ دینے والی بکری کو ذبح کرنے سے اجتناب کرنا تاکہ گھر والوں کے لیے دودھ مہیا ہوتا رہے۔میزبان نے بکری ذبح کی،کھانا تیار کیا،اور اپنے ذی وقار مہمانوں کو پیش کیا۔سب نے مل کر یہ مزیدار کھانا کھایا،ٹھنڈا پانی پیا،تازہ کھجوریں کھائیں اور اللہ کا شکرادا کیا۔سیدی خیر البشر ﷺ نے اس موقع پر اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا؛

دیکھئے؛ میرے اللہ کریم کے انعامات،تم گھر سے نکلے تو بھوکے تھے،اس نے تمھیں کھانا میسر کیا۔

اُس ذات کی قسم؛ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے،کل قیامت کے دن ان نعمتوں کے بارے میں ضرور سوال ہوگا۔

(مسلم۔باب کتاب الاشربہ)

□□□□□□□□

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ذیشان قرآن مجید کی درج ذیل آیت کے مطابق ہے۔
اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم (سورہ التکاثر)

''پھر ضرور اُس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی''۔

□□□□□□□□

اللہ تعالیٰ نے انسان کو لامحدود نعمتوں سے نوازا ہے،خود قرآن نے کہا ہے کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو بھی پورا شمار نہیں کر سکتے۔ان نعمتوں کا عطا کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک دن انسان سے ان کے استعمال کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔یہی وہ بات ہے جس کی یاد دہانی رسول اللہ ﷺ یہاں فرما رہے ہیں۔

□□□□□□□□

سیدنا جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ:

ایک دن میں اپنے غریب خانہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ سیدی خیر البشر ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا۔آپ ﷺ نے مجھے دیکھ کر اشارے سے اپنی طرف بلایا،آپ ﷺ نے بے تکلفانہ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چل پڑے(ظاہر ہے کہ باتیں بھی کرتے گئے ہوں گے،کیا ہی محبوبانہ انداز ہے) چلتے چلتے حتیٰ کہ ازواج مطہرات کے حجروں میں سے کسی حجرے میں داخل ہو گئے۔آپ ﷺ اندر داخل ہو گئے،پھر مجھے بھی اندر آنے کی اجازت عطا فرمائی۔ازواج مطہرات پردے میں چلی گئیں۔حضور ﷺ نے گھر والوں سے پوچھا؛کچھ کھانے کو ہے؟جواب آیا کہ جی کھانا موجود ہے۔پھر تین روٹیاں لائی گئیں اور

انھیں نبی اکرم ﷺ کے آگے رکھ دیا گیا، رسول اللہ ﷺ نے ایک روٹی اپنے آگے رکھی اور دوسری روٹی میرے آگے کردی۔ تیسری روٹی کو ادھا ادھا کر کے ایک ٹکڑا اپنے آگے رکھا اور ٹکڑا مجھے عطا کیا (کیسی خوش بختی ہے سیدنا جابر کی) پھر آپ ﷺ نے گھر والوں سے پوچھا؟ گھر میں کوئی سالن بھی ہے، گھر والوں نے جواب دیا سر کے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ فرمایا وہی لے آؤ، سر کہ تو کیا خوب سالن ہے۔

(مسلم، کتاب الاشربہ)

□□□□□□□□

انھی سیدنا جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ:

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے اور ہم نے آپ ﷺ کو تر و تازہ کھجوریں کھلائیں اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ان نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا۔

(مسند احمد)

□□□□□□□□

ان روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ کس قدر بے تکلفانہ ماحول میں رہتے تھے۔ ان کے گھروں پر تشریف لے جاتے اور وہ جو کچھ بھی حاضر کرتے اس سے لطف اندوز ہوتے۔ آپ ﷺ خود اپنے گھر میں بھی صحابہ کو لے آتے اور جو کچھ گھر میں موجود ہوتا مل کر بے تکلفانہ تناول فرماتے۔ پھر ہر ایسے موقع سے فائدہ بھی اٹھاتے اور موزوں الفاظ میں مختصراً اخروی زندگی کی طرف توجہ بھی دلاتے۔ اس سے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی حکمت تبلیغ کا پتا چلتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ کھانے پینے کی بعض اشیا کے معاملے میں حضور ﷺ کے شخصی ذوق کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسے سر کہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ بہترین سالن ہے، یا کبھی آپ ﷺ نے کدو کی تعریف

فرمائی، یا ایک موقع پر آپ ﷺ نے کھجور کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ جس گھر میں کھجور نہ ہو وہ لوگ بھوکے ہیں۔اسی طرح سیدنا ابو ایوب انصاری کی روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے ہمارا بھیجا ہوا کھانا اس لیے تناول نہ فرمایا کہ اس میں لہسن ڈالا گیا تھا۔میں نے آپ سے پوچھا؛ کیا لہسن حرام ہے آپ ﷺ نے نہیں، بلکہ میں اس کی بو کو ناپسند کرتا ہوں۔یہ چیزیں شخصی ذوق کا اظہار ہیں ،دین کا مطالبہ نہیں۔آپ ﷺ اکثر اوقات خود یا کسی کے استفسار کرنے پر یہ وضاحت فرما دیتے تھے ۔اس چیز کے واضح نہ ہونے سے بعض شدت پسند طبائع نے دین میں کئی قسم کی پابندیاں پیدا کر لی ہوئی ہیں۔

اللھم صلی علی محمد و علی محمد و بارک و سلم علیہ

یہ بات معلوم ہے کہ سیدی محمد کریم ﷺ نے ۴۰ سال کی عمر اعلان نبوت فرمایا۔ نبوت ورسالت ایک منصب ہے جو اللہ کریم اپنی صوابدید پر عطا کرتے ہیں۔ اس منصب پر اللہ تعالیٰ کس معیار کو مدنظر رکھتے ہیں کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ جن ہستیوں کو اس منصب پر فائز کیا جاتا ہے وہ اپنے اپنے دور کے بہترین لوگ تھے۔ سیرت و کردار کے حوالے سے یہ ہستیاں بلاشبہ اپنے معاشرے کا مکھن ہوتی ہیں۔ محمد ابن عبداللہ بھی اپنی قوم کا تارا تھے مقدس زندگی کے چالیس سال آپ ﷺ نے اہل مکہ کے درمیان گزارے۔ یہ مدت کوئی معمولی مدت نہیں ہوتی۔ اس دوران میں انسان کا کردار اور اس کے اخلاق و اعمال کھل کر دنیا کے سامنے آجاتے ہیں۔ عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں سوچیں اپنا راستہ متعین کر لیتی ہیں۔ انسان کا مطمع نظر واضح ہو جاتا ہے اور آئندہ کے عزائم سامنے آجاتے ہیں۔ محمد ابن عبداللہ ﷺ نے جب آنکھ کھولی تو شفقت پدری سے محروم تھے۔ ابھی چھ سال کی عمر کے تھے کہ والدہ محترمہ کا سایہ بھی سر اٹھ گیا۔ آٹھ سال کے تھے کہ دادا عبدالمطلب بھی اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ گویا لڑکپن میں ہی سارے مادی سہارے جاتے رہے۔ ایسے بچے عموماً حالات کے رحم و کرم ہونے کی وجہ سے ناتراشیدہ اور غیر تربیت یافتہ رہ جاتے ہیں اور عموماً معاشرے کے لیے سود

مند ثابت نہیں ہوتے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حالات کی یہ سختی اور عزیز ترین ہستیوں کی عدم موجودگی کے باوجود محمد بن عبداللہ (ﷺ) ایک عمدہ نوجوان کی شکل میں پروان چڑھتے ہیں۔نامساعد حالات ان کی شخصیت پر منفی کی بجائے مثبت اثرات پیدا کرتے ہیں۔ماں کی گود سے محروم کر کے فطرت ان کو اپنی گود میں لے لیتی ہے۔دادا کی شفقت سے محروم ہو کر براہ راست رب کریم کے دامن رافت میں آجاتے ہیں۔کائناتی قوتیں اس ہیرے کو سنبھالنے اور سنوارنے میں لگ جاتی ہیں جبکہ شیطانی قوتیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔مذہبی شخصیات عموماً انفرادی زندگی گزارتے ہیں اور ان پر رہبانیت کا غلبہ ہوتا ہے۔وہ معاشرے سے کٹے ہوئے لوگ ہوتے ہیں اور انھیں دنیا اور اس کے لوازمات سے دوری پر مزا آتا ہے۔لیکن محمد ﷺ ایسی ہستی ہیں کہ جو قبل از نبوت بھی اور بعد از نبوت بھی معاشرے میں مصروف ترین عملی زندگی گزارتے ہیں۔وہ ایک فعال سماجی کارکن کے طور پر زندگی گزارتے ہیں، سماج میں آپ کو ایک باعزت مقام حاصل تھا۔اہل مکہ آپ کی دیانتداری ،راست روی اور معاملہ فہمی سے خاصے متاثر تھے۔

سیدہ خدیجہؓ کا بیان ہے کہ:

> ''اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہیں کریں گے۔آپ سچ بولتے ہیں، رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، مہمان نوازی آپ کی عادت ہے، بھلا ایسے اوصاف والا آدمی ضائع کیا جا سکتا ہے، اللہ کریم آپ کو منتخب لوگوں میں شامل کرے گا۔آپ نیکی اور خدمت کے کاموں میں آگے رہتے ہیں۔بے سہارا لوگوں پر مال خرچ کرنے والے ہیں اور آپ اخلاق کریمانہ کے مالک ہیں''۔

□□□□□□□□

سیدہ طاہرہ پندرہ برس سے آپ ﷺ کے ساتھ تھیں۔آپ کی تنہائی کی ساتھی اور رازداں تھیں۔آپ کے عادات وخصائل سے سب سے زیادہ وہی آگاہ تھیں۔ان کی گواہی سے بڑی گواہی کس کی ہوسکتی ہے۔ان صفات میں جن کا تذکرہ سیدہ نے فرمایا ہے نمایاں ترین چیز یہی ہے کہ آپ معاشرے کے

پسے ہوئے اور راندہ لوگوں کے ہمدرد اور سہارا تھے۔ خدمت کے کاموں میں آگے رہنے والے اور معاملات میں خالص تھے۔ قبل از نبوت کی زندگی میں رسول رحمت ﷺ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ''حلف الفضول'' میں شرکت ہے۔

جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں عبداللہ بن جدعان کے گھر پر ایک ایسے معاہدے میں شامل ہوا کہ (اس میں شرکت نہ کرنے کے) بدلے اگر مجھے سرخ اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں انھیں قبول نہ کرتا۔ آج اسلام کے دور میں بھی مجھے اس جیسے کسی معاہدے میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے تو میں اس دعوت کو قبول کرلوں گا''۔

یہ معاہدہ کیا تھا، چند سرکردہ لوگوں کا ظلم کے خلاف مظلوم کے دست و بازو بننے کا تاریخی عہد تھا جو حضور ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب کی تجویز پر ایک محفل میں کیا گیا تھا۔ نبی رحمت بھی ان افراد میں شامل تھے اور ساری زندگی آپ ﷺ اس معاہدے کی تعریف کرتے رہے اور پابندی کرتے رہے۔ اس معاہدے میں شرکت اس چیز کی غماز ہے کہ میرے آقا ﷺ اجتماعی فلاحی کاموں میں حصہ لینے کو پسند کرتے تھے۔ یہ چیز تقویٰ کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ حقدار کو حق دلانے کی جدوجہد کا عزم، ظالم کو ظلم سے روکنے کا عہد اور مظلوم کی حمایت کا عہد، کیا کوئی معمولی بات ہے۔ کوئی کم ہمت کوتاہ کامت اور رہبانیت کا رسیا، ایسے معاہدے میں شامل ہوسکتا ہے؟

خیر کے کام میں حصہ لینا اور سماج سے ناانصافی کے خاتمے کی جدوجہد کرنا اسوہ پیغمبر ہے۔

اس معاہدے کی برکات سے، قبائل عرب جو باہم مقابل تھے شیر وشکر ہوگئے۔ بے کس اور بے نوا سر اٹھا کے چلنے لگے۔ عورتوں کو بیوگی کے صدمات سے نجات ملی اور یتیموں کو غاصبوں سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ معاہدہ حلف الفضول کی تعریف میں آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ آج بھی اگر اس طرح

کے معاہدے کی طرف مجھے بلایا جائے تو میں اس میں شامل ہوں گا۔آپ ﷺ کی یہ خواہش محض خواہش نہ ہے بلکہ عاشقان رسول کے لیے حکم ہے۔وہ تو صرف ایک معاہدہ تھا، میرے آقا نے تو پورا دین ہی ایسا عطا کیا ہے جو الفت ومحبت، رافت ورحمت اور باہمی اخوت کا داعی ہے۔

جس میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ کا جو بندہ بے شوہر والی اور بے سہارا عورت اور کسی مسکین حاجت مند آدمی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتا ہے، وہ اجروثواب میں اس مجاہد بندہ کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں دوڑ دھوپ کرتا ہو، راوی کہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اور اس شب بیدار بندہ کی طرح ہے جو رات بھر نماز پڑھتا ہو اور تھکتا نہ ہو اور اس دائمی روزہ دار کی طرح ہے جو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو اور کبھی روزہ کے بغیر نہ رہتا ہو"۔

(معارف الحدیث ۱۲ ۲۱۱)

□□□□□□□□

حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ایک دوسرے سے حسد نہ کرو،

ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو،

ایک دوسرے سے روگردانی نہ کرو،

اللہ کے بندو بھائی بھائی بن کے رہو،

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے لہذا اس پر ظلم نہ کرے،

اسے رسوا نہ کرے۔

اپنے کسی بھائی کو حقیر نہ جانے۔

(مسلم شریف)

□□□□□□□□

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قیامت کے دن خداوند تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے، میں بیمار پڑا، تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہے گا اے میرے پروردگار، تو سب جہانوں کا مالک ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہ کی اگر تو وہاں جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر اللہ کریم فرمائے گا۔ اے آدم کے بیٹے میں نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا: اے پرودگار: تو تو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے (تجھے کھانے کی کیا احتیاج) میں تجھے کیسے کھلاتا۔ رب تعالیٰ فرمائے گا تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرا فلاں بندہ بھوکا ہے اگر تو اس کو کھلاتا تو آج اس کا بدلہ مجھ سے پاتا۔ اے آدم کے بیٹے، میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے نہ پلایا: بندہ عرض کرے گا: تو سارے عالم کا پرودگار ہے میں تجھے کیسے پانی پلاتا تو اللہ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو اس کو نہیں پلایا اگر تو اس کو پلاتا تو آج اس کا اجر یہاں پاتا۔

□□□□□□□□

اے ایمان والو:

جو مال ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے اس دن کے آنے سے پہلے پہلے خرچ کرلو جس میں نہ سوداگری ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی سفارش کام آئے گی۔ اور کفر کرنے والے ہی ظالم ہیں"۔

(سورہ۔بقرہ 452/2)

□□□□□□□□

اے لوگو جو ایمان لائے ہو؛

تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں، جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں، جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس وقت وہ کہے کہ اے میرے رب کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا۔ حالانکہ جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو اللہ اس کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔

(سورہ المنافقون۔63/ 9 تا11)

□□□□□□□□

اے یمان والو:

"تم اپنے صدقات اور خیراتوں کو احسان جتلا کر اور ایذا دے کر برباد نہ کرو، اس شخص کی طرح جو لوگوں پر خرچ کرتا ہے محض دکھلاوے کے لیے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا"۔

(سورہ البقرہ 2/ 264)

اللھم صلی علی محمد و علی محمد و بارك و سلم علیه